جون
۲۰۱۱ء

اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر: ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد ۲۲، شمارہ ۶ جون ۲۰۱۱ء/ رجب ۱۴۳۲ھ

مشمولات

نرمی یا علماء کرام! نرمی	مدیر	۲
○پاکستانی معاشرہ		
سماجی تبدیلی کی ضرورت	ڈاکٹر محمد امین	۳
○دینی تعلیم		
دینی مدارس کا نظام تعلیم و نصاب اصلاحی پیکج پر چار وفاقوں کے علماء کرام کا اتفاق	ادارہ	۶
دینی مدارس اور عصری تعلیم	مدیر	۱۳
○میڈیا		
دینی مدارس میں میڈیا کی تعلیم	عاصم حفیظ	۱۸
○جدید تعلیم		
بچوں کی اسلامی تربیت میں سکول انتظامیہ کا کردار (۳)	مدیر	۲۳
○تفہیم مغرب		
مغربی تہذیب کا فکری پس منظر	احمد جاوید	۳۱
○دینی تناظر		
وسطیہ: اسلام کا فلسفۂ اعتدال	ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی	۴۱
غامدی مکتب فکر	مولانا عبدالقیوم حقانی	۴۹
○تزکیۂ نفس		
فکرِ آخرت	احمد جاوید	۵۵
○ کس قیامت کے یہ نامے	ادارہ	۶۱
○فہرست تالیفات	ادارہ	۶۲

نرمی یا علماء کرام! نرمی

پچھلے دنوں اخبارات پر نظر دوڑاتے ہوئے چند خبریں نظر سے گزریں۔ ایک یہ کہ سعودی عرب میں علماء کرام کی عدالت نے ڈرائیونگ کرنے والی سعودی خاتون کو دس سال سزائے قید دے دی۔ دوسری یہ کہ وسط ایشیائی ممالک میں حسینۂ عالم کے انتخاب میں حصہ لینے والی ایک مسلمان لڑکی کو اسلامی تحریکوں نے قتل کرنے کا فتویٰ جاری کر دیا۔ اور تیسری یہ کہ بعض پاکستانی علماء کرام نے بائبل کے خلاف مقدمہ چلانے کا اعلان کر دیا۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ اسلامی اقدار ہم سب کو عزیز ہیں اور ان پر عمل ہونا چاہیے اور مغرب کی ملحدانہ تہذیب کی اندھی پیروی سے باز آنا چاہیے لیکن کیا اسلام صرف جبر اور کوڑوں کا دین ہے؟ کیا اس کی اولین ترجیح سختی اور حدود کا نفاذ ہے؟ شریعت لانے اور نافذ کرنے والے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کمزور اور غریب شخص کو معاف کر دیا تھا جس نے رمضان کا روزہ عملاً توڑ دیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خاتون کی توبہ کو عظیم الشان قرار دیتے ہوئے اس کے لیے دعائے مغفرت کی تھی جس سے زنا کا جرم سرزد ہو گیا تھا اور ایک دفعہ فرمایا کہ میں کعبے کی توسیع کرنا چاہتا ہوں لیکن قریش کے ردعمل کی وجہ سے رکا ہوا ہوں۔ اور فرمایا حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہ اگر اسلام پہلے ہلے ہی میں شراب نوشی پر پابندی لگا دیتا تو کوئی اس پر عمل نہ کرتا۔ اور فرمایا ماضی قریب کے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کہ اگر مجھے اقتدار مل جائے تو نفاذ حدود سے پہلے دس سال تک لوگوں کی اصلاح کروں گا۔ اور فرمایا اسلامی انقلاب کی علمبردار جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودیؒ نے قیام پاکستان کے بعد کہ جب تک ماحول کو نہ بدلا جائے حدود نافذ نہیں ہونی چاہئیں!

ہم درخواست کرتے ہیں علماء کرام سے، اسلامی سکالرز سے اور دین نافذ کرنے کی خواہش مند تحریکوں اور جماعتوں سے کہ خدا کے لیے! نرمی، رِفق اور شفقت اللہ کی مخلوق پر اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت پر جسے اللہ نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا اور ایک دوسرے پیغمبر کی زبان سے کہلوایا کہ 'اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ'☆۔ لوگوں پر سختی کرنے سے پہلے انہیں پیار و محبت سے سمجھایئے، ان کے دل و دماغ کو بدلنے کی کوشش کیجیے۔ آپ نفرت کیجیے بدی سے نہ کہ بدوں سے اور گناہ سے نہ کہ گناہگاروں سے۔

☆ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے فرمایا تھا "اور میں تو جہاں تک بس چلے اصلاح ہی کرنا چاہتا ہوں (ھود ۱۱:۸۸)

ڈاکٹر محمد امین

سماجی تبدیلی ـــ وقت کی اہم ضرورت

معروف ماہر معاشیات جناب محمود مرزا صاحب کا ایک مضمون سماجی تبدیلی کے حوالے سے ایک مقامی روزنامے میں شائع ہوا ہے۔ ان کی تجویز بہت معقول ہے کہ ہمارے سیاستدانوں کو سماجی تبدیلی کے لیے کام کرنا چاہیے اور قوم کو اسے ہی بطور معیار انتخابات کے وقت سامنے رکھنا چاہیے۔ تاہم، ہمارے ہاں جس قسم کا سیاسی کلچر اور سیاستدان پائے جاتے ہیں، ان سے اس بات کی توقع کم ہی ہے کہ وہ اس طرف آئیں گے۔

البتہ سماجی تبدیلی کے حوالے سے ہمارے ذہن میں ایک تجویز ہے جسے ہم اہل دانش کے سامنے غور وفکر کے لیے پیش کر رہے ہیں تاکہ اگر اس میں وزن ہو تو اس پر عمل درآمد کی راہیں کھلیں۔

ہمارا مؤقف یہ ہے کہ:

۱۔ سماجی تبدیلی حکم شرعی ہے یعنی اگر مسلمان قرآن وسنت کے احکام پر عمل کریں تو اس کے نتیجے میں سماجی تبدیلی لازماً واقع ہوتی ہے لہٰذا سماجی تبدیلی لانا اور اس کا ذریعہ بننا ہر مسلمان کے لیے ایک شرعی تقاضا ہے مثلاً معاشی شعبے میں اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ غریب کو کھانا کھلاؤ اور اپنا زائد از ضرورت سرمایہ غرباء ومساکین پر خرچ کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ وہ مومن نہیں ہے جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا ہمسایہ بھوکا سوئے۔ سماجی شعبے میں فرمایا کہ راستے سے کانٹا ہٹانا بھی صدقہ ہے اور وہ مسلمان نہیں جو دوسروں کی اذیت کا سبب بنے لیکن جب سٹریٹ لائٹ نہیں ہوتی یا گلی کے گٹر اُبل رہے ہوتے ہیں تو ہم بے حسی سے یہ سب دیکھتے رہتے ہیں اور ہمیں ذرا احساس نہیں ہوتا کہ ہم احکام شریعت کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ عدل وانصاف کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر صورت میں عدل کرو خواہ اس کی زد خود تم پر ہی پڑتی ہو اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ لوگوں نے کہا مظلوم کی مدد تو واضح ہے ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا اسے ظلم نہ کرنے دو۔ اسی طرح اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دو اور انہیں بُری باتوں سے روکو تاکہ معاشرے کی اصلاح ہوتی رہے اور بگاڑ اور فساد بڑھ نہ جائے۔

ہم نے اختصار کی خاطر اور محض بطور مثال دو تین شعبوں کی چند دینی تعلیمات کا یہاں ذکر کیا ہے ورنہ ظاہر ہے زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے احکام اسی طرح کے ہیں لیکن یہ ہماری نالائقی ہے کہ ہم نے دین کو صرف نماز روزے جیسی چند عبادات یا چند ظاہری اعمال جیسے داڑھی بڑھانا، سر ڈھانپنا یا شلوار قمیض پہننا تک محدود کر رکھا ہے۔اسی طرح ہمارے علماء کرام مسجدوں اور مدرسوں میں یہ آیات و احادیث ہمیں سناتے ہیں لیکن عملی زندگی پر ان کا اطلاق نہیں ہو پاتا لیکن صوفیاء کرام نے اسے عملی جہت دی اور ان کے لائحہ عمل میں اللہ کے ذکر اور صحبت صالح کے ساتھ خدمت خلق کا نکتہ بھی لازماً شامل ہوتا تھا یعنی اللہ کو راضی کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی مخلوق کی خدمت کی جائے اور ان کی پریشانیاں اور مشکلات دور کی جائیں۔ یہ عین اسلامی سپرٹ ہے۔

۲۔ ہمارے معاشرے کو جو مسائل آج درپیش ہیں اور جنہوں نے گھمبیر صورت اختیار کر کے زندگی کو بدصورت اور ناقابل برداشت بنا دیا ہے اور معاشرہ رہنے کے قابل نہیں رہا، یہ شدید مسائل حل ہو سکتے ہیں یا کم از کم ان میں معتدبہ کمی آسکتی ہے اگر ہمیں احساس ہو جائے کہ جن امور کا ہمیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حکم دیا ہے اور جن سے سماجی تبدیلی واقع ہوتی ہے اور جن سے ہمارے مسائل حل ہو سکتے ہیں، ہم ان پر عمل ہی نہیں کر رہے اور ہم اس کے لیے منظم و متحرک ہی نہیں ہیں۔ ہمارے مسائل کیا ہیں؟ اتنی غربت کہ لوگ بھوک کے مارے خودکشیاں کر رہے ہیں (معیشت)۔ انصاف کا نہ ملنا کہ برسوں تک عدالتوں میں مقدمے چلتے رہتے ہیں (عدل و انصاف)، شہری سہولتوں کی نایابی جیسے سٹریٹ لائٹ کا نہ ہونا، اُبلتے ہوئے گٹر یا پارکوں میں لاابالی نوجوانوں کی غیر صحت مند سرگرمیاں (معاشرت)۔

۳۔ سوال یہ ہے کہ اگر حکومت ہمارے معاشرے کے یہ مسائل حل نہیں کر رہی۔ ہمارے حکمرانوں کو اس کا احساس نہیں یا ان میں اس کی صلاحیت نہیں اور ہماری بیوروکریسی بھی بے حس ہے۔ اور ہمارے وہ سیاستدان جو اس وقت اپوزیشن میں ہیں اور اقتدار میں آ کر ہمارے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں (خواہ وہ سیکولر ہوں یا مذہبی) ان کی ساری جدوجہد اور کوششوں کا ہدف سیاست اور سیاسی تبدیلی ہے اور سماجی تبدیلی کے لیے نہ ان کے پاس وقت ہے اور نہ توجہ، تو آخر کیوں نہ ہم سول سوسائٹی کے لوگ جو مسلمان ہیں متحرک اور منظم ہو جائیں اور ان کاموں کو، جنہیں کرنے کا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے، منظم انداز میں کریں تاکہ ہمارا دینی فریضہ بھی پورا ہو جائے اور لوگوں کے مسائل بھی حل

ہوجائیں۔ ہم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ ممکن ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ جو لوگ اس بات کو سمجھیں وہ متحرک اور منظم ہوکر یہ کام پرائیویٹ سیکٹر میں کریں اور اس میں کوئی امر مانع نہیں۔ یہ کام آئین اور قانون کی حدود میں رہتے ہوئے مؤثر انداز میں کیا جا سکتا ہے اور جو جمہوریت ہمارے ہاں موجود ہے وہ بہت ناقص اور بُری سہی لیکن اس کام کی گنجائش بہرحال اس میں موجود ہے۔

اس منہج سے زندگی کے ہر شعبے میں کام کیا جا سکتا ہے اور مسائل حل کیے جا سکتے ہیں مثلاً ایسی زکوٰۃ فاؤنڈیشن بنا کر جس میں قوم کے نیک نام، ثقہ اور قابل اعتماد افراد شامل ہوں، زکوٰۃ وصدقات کے کروڑوں روپے جمع کر کے غریبوں محتاجوں کی مدد کی جا سکتی ہے اور صحت اور تعلیم کے منصوبے چلائے جا سکتے ہیں۔ ہر گاؤں، قصبے اور شہر میں مصالحتی عدالتیں بنائی جا سکتی ہیں جن میں مقامی علماء ریٹائرڈ جج وغیرہ شامل ہوں تا کہ لوگوں کو سستا اور فوری انصاف مل سکے۔ ہر محلے میں ایک کمیٹی بنائی جا سکتی ہے جو خدمت خلق اور اصلاح معاشرہ کا کام کرے مثلاً بیواؤں، محتاجوں کی مدد کے لیے مقامی طور پر فنڈز اکٹھے کیے جائیں۔ گلی میں روشنی اور پانی کی نکاسی کی نگرانی ۔۔۔ جیسے کام بھی یہی کمیٹی کر سکتی ہے اور امن وامان کی خاطر محلے کے نوجوانوں کی ڈیوٹی لگائی جا سکتی ہے کہ وہ رات کو باری باری پہرہ دیں تا کہ چوری چکاری سے محفوظ رہا جا سکے۔ غرض ہر شعبۂ زندگی میں مسائل کے حل کے لیے اسی طرح کام کیا جا سکتا ہے مثلاً غریبوں کے لیے ڈسپنسری اور سکول کھولے جا سکتے ہیں، تعمیری میڈیا پروگرام بنائے جا سکتے ہیں ۔۔۔ وغیرہ۔ یہ چند باتیں ہم نے بطور مثال عرض کی ہیں ورنہ ہر شعبۂ زندگی کی اصلاح اور مسائل کے حل کے لیے ایک تفصیلی فہرست بنائی جا سکتی ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے ماہنامہ البرہان، لاہور شمارہ مارچ و اپریل میں ہمارا مضمون 'ہمارے معاشرے کا بحران اور اس کا حل')۔

ہماری یہ اسکیم ممکن ہے ان لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے یا انہیں بھلی نہ لگے جو مغربی تہذیب کے زیر اثر سیکولر سوچ رکھتے ہیں ورنہ جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے وہ شریعت کے احکام پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ شریعت نام ہی ان اصولوں اور تعلیمات کا ہے جو زندگی گزارنے کا طریقہ سکھاتی ہیں اور ان پر عمل دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ ہماری خامی یہ ہے کہ ہم ان تعلیمات پر کماحقہ عمل نہیں کرتے ورنہ جس طرح ہمارے اسلاف نے ان تعلیمات پر عمل کیا تھا اور دنیا میں سرخروئی حاصل کی تھی، اسی طرح ہم بھی یہ کر سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ سول سوسائٹی کے افراد متحد اور متحرک ہوکر مطلوبہ سماجی تبدیلی کے لیے جدوجہد کر سکتے ہیں اور اپنے بیشتر مسائل حل کر سکتے ہیں خواہ حکومت اور سیاستدانوں کی کمک انہیں نہ بھی حاصل

ہو۔اس طرح کا کامیاب تجربہ ترکی میں گولن تحریک نے کیا ہے، انڈونیشیا میں بھی انہی خطوط پر کام ہو رہا ہے۔سوال یہ ہے کہ ہم یہ کام پاکستان میں کیوں نہیں کر سکتے؟

راقم نے ۲۰۰۰ء میں مجلس فکر ونظر☆ کے پلیٹ فارم سے اہل سنت کے سارے مکاتب فکر کے علماء کرام سے مل کر دینی مدارس کے نظام تعلیم خصوصاً ان کے نصاب کی اصلاح اور اسے مزید مؤثر بنانے کے لیے منظم جدوجہد کا آغاز کیا۔اس سلسلے کا پہلا اجلاس جامعہ اشرفیہ لاہور میں ۱۲ جولائی ۲۰۰۰ء کو ہوا اور پھر ایک ورکنگ پیپر تیار کر کے مختلف مکاتب فکر کی جامعات میں اس پر شق وار بحث ہوتی رہی۔ بالآخر ٦ فروری ۲۰۰۱ء کو جامعہ مرکز علوم اسلامیہ منصورہ لاہور میں سارے مکاتب فکر کے علماء کرام کے ایک مشترکہ اجلاس میں متفقہ طور پر ایک اصلاحی پیکج منظور کرلیا گیا اور دینی تعلیم کے چاروں وفاقوں سے تعلق رکھنے والے سارے مکاتب فکر کے علماء کرام نے اس پر اپنے تائیدی دستخط ثبت فرما دیے۔ مذکورہ اصلاحی پیکج کی متفقہ سفارشات کے مندرجات قارئین البرہان کے لیے شائع کیے جا رہے ہیں۔ مذکورہ پیکج اور متعلقہ مباحث ہماری کتاب 'ہمارا دینی نظام تعلیم' کا ایک حصہ ہیں جو مکتبہ البرہان سے طلب کی جا سکتی ہے۔ امین

دینی مدارس کا نظام تعلیم ونصاب

اصلاحی پیکج پر چاروفاقوں کے علماء کرام کا اتفاق

مقاصد

ان سفارشات کا مقصد یہ ہے کہ:

۱۔ دینی مدارس کے طلبہ کے علم میں مزید رسوخ پیدا ہو۔

۲۔ ان کے اخلاق وللّٰہیت میں اضافہ ہو۔

۳۔ مسلکی تعصّبات کا خاتمہ ہو۔

۴۔ طلبہ میں عصری تحدیات سے نمٹنے کی صلاحیت پیدا ہو۔

علماء کی تیاری کے مقاصد

۱۔ مساجد میں امامت وخطابت اور قرآن ناظرہ وحفظ کے علاوہ ترجمہ قرآن اور تدریس حدیث۔

۲۔ دینی مدارس میں تدریس

۳۔ جدید سکولوں/ کالجوں/ یونیورسٹیوں میں اسلامی اور عربی علوم کی تدریس وتحقیق

☆ یہ ایک علمی مجلس تھی جسے ملی مجلس شرعی اور تحریک اصلاح تعلیم (ٹرسٹ) کا پیش رو سمجھنا چاہیے۔

۴۔ عام افراد معاشرہ کی دینی تعلیم اور اصلاح

نصاب درس نظامی

(مدت تدریس: ۸ سال، داخلہ برائے مڈل پاس)

اسلامی علوم

۱۔ قرآن حکیم

۱۔ مکمل قرآن حکیم کا لفظی و بامحاورہ ترجمہ مع صرفی ونحوی تراکیب

۲۔ قرآن حکیم کے بعض منتخب حصوں کا تفسیری اور تحقیقی مطالعہ جس میں متنوع مناہج کی تفاسیر (مثلاً اثری، لغوی، فقہی، کلامی، سائنسی اور معاصر تفاسیر) شامل ہوں۔

۳۔ علوم القرآن

۴۔ تجوید کا ایک کورس سب کے لیے۔

۵۔ باقاعدہ درس قرآن کے ذریعے قرآنی مفاہیم ومقاصد کو طلبہ کے ذہن نشین کرانا

۶۔ غیر حفاظ طلبہ کے لیے حفظ کا نصاب

۷۔ آخری سال دورۂ قرآن یعنی مکمل قرآن حکیم کی تدریس

۸۔ ہر وہ مدرسہ جامعہ جہاں مکمل درس نظامی اور دورۂ حدیث کا انتظام ہو۔ وہاں شیخ الحدیث کی طرح شیخ التفسیر کا ہونا ضروری ہو۔

۲۔ حدیث وسیرت

۱۔ صحیح بخاری ومسلم کا بالاستیعاب تحقیقی مطالعہ (جو فرقہ واریت سے مبرا ہو) آخری دورۂ حدیث سے پہلے۔

۲۔ باقی کتب صحاح ستہ کا دورہ آخری سال

۳۔ علوم الحدیث

۴۔ مطالعہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۳۔ فقہ واصول فقہ

۱۔ فقہ القرآن والسنہ

۲۔ حنفی اصول فقہ

۳۔ حنبلی، مالکی، شافعی، ظاہری اور شیعی اصول فقہ کا مطالعہ

۴۔ ان سب کا تقابلی مطالعہ اور عصر حاضر کے مسائل کے حوالے سے عملی مشق

۵۔ حنفی فقہ کا ایک متن

۶۔ دیگر فقہوں کے منتخب متون کا مطالعہ

۴۔ عقیدہ

۱۔ ماضی کے کلامی مباحث و مذاہب کا منتخب مطالعہ

۲۔ معاصر مذاہب ضالّہ (قادیانیت و پرویزیت)

۳۔ تقابل ادیان

۵۔ منطق

منتخب متون کا تعارفی مطالعہ

۶۔ مطالعۂ احوال امت

۱۔ مسلمانوں کی ماضی کی تاریخ کا اجمالی مطالعہ

۲۔ موجودہ مسلم دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ

۷۔ دعوت و تربیت

۱۔ اصول دعوت (دوسروں تک دعوت پہنچانے کے آداب و شروط)

۲۔ گفتگو اور تقریر کی عملی مشق

۳۔ اصول تربیت اور اخلاق (قرآن و سنت اور کتب تزکیۂ نفس سے)

۴۔ اس کی عملی مشق

۸۔ تحقیق

۱۔ ہر ہفتے لائبریری پریڈ

۲۔ ساتویں سال طرق تحقیق کی تدریس و عملی مشق

۳۔ آخری سال تحقیقی مقالہ لکھنا

جدید علوم

۹۔ جدید سماجی علوم (معاشیات، سیاسیات، فلسفہ وغیرہ) کا تعارفی و تنقیدی مطالعہ

۱۰۔ جدید سائنسی علوم (طبیعیات، حیاتیات، کیمیا وغیرہ) کا تعارفی و تنقیدی مطالعہ

۱۱۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا تعارفی پیکج

زبانیں

۱۲۔ عربی: سمجھنے کے علاوہ عربی بولنے اور لکھنے (انشاء) کی عمدہ مہارت

ضروری اقدامات

۱۔ عربی کے متخصص اساتذہ کا تقرر

۲۔ طریقہ مباشر اور طریق قواعد کے امتزاج پر مبنی نیا تدریسی منہج

۳۔ پہلے سال کے بعد عربی زبان کے پیریڈ میں اردو بولنے پر پابندی اور آخری دو سالوں میں ذریعہ تعلیم بھی عربی ہو۔

۴۔ پندرہ روزہ بزم ادب اور تقریری وتحریری مقابلے

۵۔ ترجمہ

۱۳۔ اردو: اوردو بولنے اور لکھنے کی عمدہ صلاحیت

اقدامات

۱۔ اردو کے دینی ادب کی تدریس

۲۔ اردو کے متخصص اساتذہ کا تقرر

۳۔ پندرہ روزہ بزم ادب اور تقریری وتحریری مقابلے

۱۴۔ انگریزی: انگریزی پڑھنے، سمجھنے اور بولنے کی متوسط درجے کی صلاحیت

اقدامات

۱۔ متخصص استاد کا تقرر

۲۔ اندازاً بی اے کی سطح تک کی تدریس

۱۵۔ فارسی: پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت

۱۶۔ علاقائی زبانوں میں اظہار مدعا کی حوصلہ افزائی

دراسات علیا

بڑے دینی مدارس اپنے آپ کو آٹھ سالہ درس نظامی تک محدود نہ رکھیں بلکہ اس کے بعد تخصص اور تحقیق کی تعلیم بھی جاری رکھیں جس کی کچھ تفصیل یوں ہے:

۱۔ درجہ تخصص (درس نظامی کے بعد دوسالہ تحقیقی پروگرام: مساوی ایم فل)

پہلے تین ماہ طرق تحقیق و اساسی موضوعات کی تدریس و تسجیل موضوع

موضوعات

۱۔ قرآن وعلوم القرآن، حدیث وعلوم الحدیث، فقہ واصول فقہ، اسلام اور جدید مسائل وغیرہ

۲۔ درجۂ تحقیق (درجہ تخصص کے بعد ۳ سالہ فل ٹائم اور ۵ سالہ پارٹ ٹائم تحقیقی پروگرام: مساوی پی ایچ ڈی)

موضوعات کی تسجیل کے وقت مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھا جائے:

۱۔ تقابلی مطالعے کو ترجیح دی جائے

۲۔ پٹے پٹائے موضوعات کی بجائے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جائے جن کی عصر حاضر اور پاکستانی معاشرے کے حوالے سے اہمیت ہو۔

۳۔ تحقیق میں تخلیقیت اور اصالت پر اصرار کیا جائے۔

متفرق امور

داخلہ: درس نظامی میں داخلہ صرف ایسے مڈل پاس طلبہ کو دیا جائے جو ناظرہ پڑھ سکتے ہوں یا ان حفاظ کو جو مطلوبہ استعداد رکھتے ہوں۔

امتحان: ۱۔ ہر تعلیمی سال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر حصے کے آخر میں امتحان نہائی ہو جائے۔

۲۔ امتحان میں معروضی سوالات بھی دیے جائیں

۳۔ پاس ہونے کے لیے ۴۰ فیصد نمبر حاصل کرنا ضروری ہوں اور مجموعی طور پر ۵۰ فیصد۔

۴۔ تقریری/زبانی امتحان بھی ہونا چاہیے

تدریس اساتذہ

۱۔ نئے اساتذہ کی تربیت

۲۔ موجودہ اساتذہ کے لیے ریفریشر کورسز

۳۔ ناظمین و مہتممین مدارس کی تربیت

تربیت طلبہ

۱۔ ہر مدرسہ میں تربیت طلبہ کے کام کو اہمیت دی جائے اور اس کو منظم کیا جائے مثلاً اساتذہ میں سے ہر کلاس کا ایک مربی ہو، طلبہ میں سے بھی ایک مربی ہو۔ ناظم مدرسہ (یا اس کا نامزد کردہ استاد) بطور مرکزی مربی کام کرے۔ ان لوگوں پر مشتمل ایک تربیتی کمیٹی ہو جس کا اجلاس ہر ماہ باقاعدگی سے ہو۔

۲۔ ہر امتحان میں عملی تربیت کا ایک پرچہ ہو جس کے ۱۰۰ نمبر ہوں اور اس میں پاس ہونا لازمی ہو۔

۳۔ صالح طلبہ کے لیے حوصلہ افزائی کے انعامات رکھے جائیں۔

۴۔ تربیت کے لیے ذکر و فکر کے ایسے حلقوں اور صحبت صالحین کا اہتمام کیا جائے جہاں قرآن و سنت کی تعلیمات کی سختی سے پابندی کی جاتی ہو۔

۵۔ جس طرح جدید تعلیمی اداروں میں ہفتۂ صفائی منایا جاتا ہے اسی طرح دینی مدارس میں ہفتہ صفائی کے علاوہ اخلاقی تطہیر کے لیے بھی (رذائل سے بچنے اور حصول فضائل کے لیے) ہفتے منائے جائیں اور متعلقہ موضوع کے حوالے سے ہفتہ بھر عملی پروگرام رکھے جائیں۔

متفقہ سفارشات کا خلاصہ

۔ قرآن مجید اور اس کے علوم (تجوید، تحفیظ، تفسیر، دورۂ قرآن وغیرہ) کو نصاب میں مرکزی حیثیت دی جائے

۔ کتب حدیث کے عمومی سریع مطالعے کے ساتھ ساتھ منتخب متون کا علمی اور تحقیقی مطالعہ بھی کیا جائے۔

۔ مطالعہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نصاب کا جزو بنایا جائے

۔ فقہ واصول فقہ میں فقہ مقارن کو رواج دیا جائے۔

۔ عربی زبان اس طرح سکھائی جائے کہ لکھنے، بولنے اور ترجمتین کی صلاحیت بھی طلبہ میں پیدا ہو۔

۔ منطق، فلسفہ اور علم کلام کا مطالعہ تعارفی ہونا چاہیے۔

۔ مسلم تاریخ، معاصر مذاہب ضالّہ، احوال امت، دعوت و اصلاح، تدریس فارسی و اردو اور تقابل ادیان کو بھی نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔

۔ جدید علوم اور ٹیکنالوجی خصوصاً انگریزی زبان، سماجی و سائنسی علوم اور کمپیوٹر کا بھی تعارفی مطالعہ ہونا چاہیے۔

۔ علمی اختلاف برداشت کرنے اور مسلکی تعصب ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔

۔ رسوخ فی العلم کے لیے طلبہ میں وسعت مطالعہ اور تحقیق کی عادات پختہ کی جائیں۔

۔ طلبہ کی دینی واخلاقی تربیت کو بنیادی ہدف قرار دیا جائے۔

متفقہ سفارشات پر مبنی نصاب

اہل سنت کے چار وفاقوں کے سرکردہ علماء کرام کی طرف سے تیار کردہ مذکورہ بالا متفقہ سفارشات پر مبنی ایک نصاب بھی تیار کیا گیا ہے جو ہماری کتاب 'ہمارا دینی نظام تعلیم' میں مطبوعہ موجود ہے۔

متفقہ سفارشات پر علماء کرام کے دستخط

ہمیں ان سفارشات سے اتفاق ہے:

دینی مدارس کو موجودہ صورت میں عصری علوم کی تدریس کا اہتمام اپنے ہاں کرنا چاہیے یا نہیں؟ یہ بڑے دینی مدارس کے لیے ایک اہم سوال ہے۔ ہم نے اس بارے میں اپنی طالب علمانہ رائے پیش کردی ہے کہ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے اور یہ کہ اس کام کو صحیح طریقے سے کرنے کا منہاج دوسرا ہے۔ ہم درخواست کرتے ہیں کہ علماء کرام بھی اس موضوع پر غور فرمائیں اور اس پر لکھیں۔ البرہان ان کی رائے کو خوشی سے شائع کرے گا۔ امین

ڈاکٹر محمد امین

دینی مدارس اور عصری تعلیم (۲)

اگر علماء کرام نظامِ تعلیم کی وحدت کا اصول تسلیم کر لیں اور دینی و دنیاوی تعلیم کا فرق ختم کر کے دونوں طرح کی تعلیم کو باہم سمونے اور عصری تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کو اپنی ذمہ داری قرار دے لیں اور یہ دیکھتے ہوئے کہ حکومت اس ضمن میں کچھ کرنے کو تیار نہیں، یہ فیصلہ کر لیں کہ تعلیم کی اصلاح کا کام کُلی طور پر انہیں خود ہی کرنا ہے۔ صرف دینی تعلیم اور اس کی اصلاح اور اسے مؤثر بنانے کا کام ہی نہیں بلکہ عصری تعلیم اور اس کی اصلاح اور اسے اسلام کے مطابق ڈھالنے اور مغربیت سے بچانے کا کام بھی اب انہیں ہی کرنا ہے اور یہ سابقہ مؤقف ترک کرنا ہے کہ عصری تعلیم ان کی ذمہ داری نہیں، تو انہیں اس بات سے گھبرانا نہیں چاہیے کہ وہ تو بڑی مشکل سے دینی مدارس چلا رہے ہیں، عصری سکولوں کالجوں کے لیے مالی وسائل کہاں سے آئیں گے؟ ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ قوم ان کا ساتھ دے گی اور جس طرح مسلم قوم نے برصغیر میں مسلم حکومت ختم ہونے کے بعد دینی مدارس بلکہ عصری تعلیم کے اداروں کو بھی زندہ رکھا (علی گڑھ کے علاوہ انجمن حمایت اسلام کے تعلیمی ادارے، پشاور کا اسلامیہ کالج، گجرات کا زمیندار کالج وغیرہ) وہ تعلیم کی کمرشلائیزیشن کے موجودہ مغربی رجحان کے باوجود علماء کرام کے قائم کردہ عصری علوم کے اداروں کے ساتھ بھی مالی تعاون کریں گے۔

اب اگر علماء کرام کو مذہبی اور عصری تعلیم دونوں کی ذمہ داری اٹھانا ہے تو وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جو چیلنج انہیں درپیش ہے اس کے تین مرحلے ہیں:

☆ دیکھیے مثلاً ہماری کتب: 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل'، 'ہمارا دینی نظام تعلیم' اور 'تعلیمی ادارے اور کردار سازی' وغیرہ یہ کتابیں مکتبہ البرہان سے منگوائی جا سکتی ہیں۔

۱۔سکول کی تعلیم ۲۔دینی تعلیم کا تخصص ۳۔عمرانی و سائنسی علوم کے دیگر تخصصات۔ ہر مرحلے پر تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے جو اقدامات کیے جانے مطلوب ہیں ہم برسوں سے ان پر غور کررہے ہیں اور ان پر کئی مختصر اور مفصل مضامین لکھ چکے ہیں اور کتابیں مرتب کر چکے ہیں☆ تاہم ان کا مختصر ذکر ہم سطور ذیل میں بھی کررہے ہیں تاکہ قارئین کو ہمارے نقطۂ نظر کا کچھ اندازہ ہوجائے۔ البتہ ایک بات ابتداء ہی میں سمجھ لینے کی ہے کہ اس کام کے دو اساسی تقاضے ہیں:

۔ ایک یہ کہ دینی تعلیمات کو نصابی کتب میں اس طرح مؤثر انداز میں سمویا جائے کہ وہ اپنی دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں اور مسائل کے حل کے طور پر بھی سامنے آئیں اور لازماً ایک ایسی ہمہ جہت اور متوازن شخصیت کو جنم دیں جو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کی اہل ہو۔

۔ دوسرے یہ کہ مغربی فکر وتہذیب کو رد کردیا جائے کیونکہ اس کی اساس ایسے ملحدانہ نظریات پر ہے (جیسے ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم، سائنٹسزم، لبرلزم وغیرہ) ہیں جو خلاف اسلام ہیں اور یہود ونصاریٰ کی مسلم خیرخواہی نہ صرف قرآن وسنت کی رو سے مشکوک و کالمعدوم ہے بلکہ عملاً بھی ان کی اسلام اور مسلم دشمنی ہم سب کے تجربے میں ہے لہٰذا مسلم تعلیم میں مغربی فکر وتہذیب کے اثرات کو رد کرنا عین اسلامی تقاضا ہے کیونکہ جب تک ہم مغرب کی ذہنی غلامی سے نہ نکلیں گے ہم نہ آزادانہ سوچ سکیں گے، نہ اسلام کی طرف رجوع کرسکیں گے اور نہ تعلیم (اور دوسرے شعبوں کو) اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھال سکیں گے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہم اسلام اور مغربی فکر وتہذیب کو جمع نہیں کرسکتے کیونکہ اجتماع ضدین ہونے کی وجہ سے یہ ادغام ممکن ہی نہیں بلکہ اس کا لازمی نتیجہ فکری انتشار و خلفشار ہے اور فکری انتشار کا لازمی نتیجہ ایمان کی کمزوری، شخصیت کا عدم استحکام اور بے کرداری ہے جبکہ اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کرنا اور نہ کرسکنا ہی ہماری ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسی لیے ہم نے ابتداء میں کہا تھا کہ تعلیم کی اسلامی تناظر میں تشکیل نو کرتے ہوئے ہمیں مغربی فکر وتہذیب اور مسلم تعلیم میں اس کے اثرات کو شعوری طور پر رد کرنا ہوگا۔

ان دو اصولوں کو سمجھ لینے کے بعد جن کے مطابق ہم نے تعلیم کی اصلاح اور اسلامی تشکیلِ نو کرنا ہے اب آیئے اس تشکیل نو کی بعض تفصیلات کی طرف جن میں سے بعض مطلوبات (یعنی وہ کام جو کرنے چاہئیں) اور بعض منہیات (جو کام نہیں کرنے چاہئیں) کا ذکر ہم یہاں کریں گے۔ تفصیلات کے لیے ہماری دیگر تحریروں کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ابتداء کرتے ہیں

اسکول کی تعلیم سے۔

سکول کی تعلیم (پہلی سے بارھویں تک)

مطلوبات: ا۔اسلامیات کے موجودہ مضمون کی توسیع کی جائے اور اسے جامع بنایا جائے۔ ۲۔مطالعہ قرآن وحدیث کے مضمون کا اجراء پہلی سے بارھویں تک جن میں پرائمری میں تجوید(یعنی صحیح مخارج کے ساتھ قرآن پڑھنا)اور ناظرہ کی تکمیل مع حفظ نماز و پارۂ عم کی آخری سورتیں مع ترجمہ۔ مڈل میں آخری پارہ اور اہم سورتوں کا حفظ۔ دسویں تک لفظی ترجمے کی تکمیل اور ایف اے (ثانویہ خاصہ) میں تفسیر۔ ۳۔قرآنی عربی پہلی سے بارھویں تک لازمی ہو۔ ۴۔سیکنڈری (ثانویہ) کی سطح پر گورنمنٹ کے اکثر موجودہ امتحانی بورڈز بھی سائنس گروپ اور آرٹس گروپ کی طرح اسلامک سٹڈیز گروپ کے امتحان کی سہولت مہیا کرتے ہیں۔ ان مضامین کی سکول میں باقاعدہ تدریس ہونی چاہیے بلکہ مڈل ہی سے اس کا آغاز کردینا چاہیے جیسا کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے ہوتا تھا، تاکہ جو طلبہ سکول کے بعد دینی تعلیم میں تخصص کرنا چاہتے ہیں انہیں مضبوط بنیاد میسر آجائے۔ نصاب، تدریس اور ماحول ایسا رکھا جائے کہ طلبہ دینی تعلیمات پر عمل کرنے لگیں ۔ ۵۔دینی عناصر مل کر ایک نصاب ساز ادارہ بنائیں جو نئے اسلامی مضامین کی نصابی کتب تیار کرے اور دیگر مضامین کی کتب بھی اسلامی تناظر میں مدون کرے۔۶۔ دینی عناصر کو چاہیے کہ ایک امتحانی تعلیمی بورڈ حکومت سے منظور کرالیں (جیسے آغاخان نے منظور کرایا ہے) جو حکومت کے مقررہ کردہ مضامین کے ساتھ اسلامی مضامین کا بھی امتحان لے اور سند جاری کرے۔

منہیات: مغرب کی ذہنی غلامی سے بچنے اور دینی تعلیمات پر یکسوئی کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات بالکل ناگزیر ہیں: ا۔انگریزی ذریعۂ تعلیم کا خاتمہ ۲۔غیر پاکستانی اور غیر مسلم مصنفین اور اداروں کی نصابی کتب کی ممانعت ۳۔او اور اے لیول کے امتحانات کا ترک ۴۔انگریزی یونیفارم اور دیگر مغرب زدہ ہم نصابی سرگرمیوں اور تعلیمی ماحول کا ترک ۵۔ہوشربا فیسوں کا خاتمہ۔

دینی عناصر کو چاہیے کہ وہ نظام تعلیم میں ان مطلوبات کے اضافے اور مذکورہ منہیات کے نصاب سے اخراج کے مطالبات مرکزی اور صوبائی حکومتوں سے منوانے کے لیے متحد ہوکر منظم کوششیں کریں، بھرپور دباؤ ڈالیں اور ناگزیر ہوتو احتجاجی تحریک چلائیں اور اپنے سکولوں میں تو کسی صورت

ان پر عمل نہ کریں۔

دینی تخصص کی تعلیم

۱۔ جو دینی مدارس سکول سطح کی تعلیم دینا چاہیں وہ بطور سکول اپنی رجسٹریشن کرالیں ورنہ سکول کے بعد کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کریں۔

۲۔ اگر طلبہ ثانویہ خاصہ کے بعد دینی مدارس میں داخلہ لیں تو ہماری تجویز ہوگی کہ دینی مدارس انہیں ۴ سال میں عالیہ (مساوی بی اے) اور کل ۶ سال میں عالمیہ (مساوی ایم اے) کرائیں۔ ہماری حکومت عرصے سے گریجوایشن (بی اے) کو چار سال کا کرنے کی کوشش کر رہی ہے لہٰذا وہ اس کی تجویز کو خوشدلی سے قبول کرے گی۔

۳۔ عربی زبان ابتدائی کلاسوں میں اردو میں اور بعد میں عربی میں پڑھائی جائے اور زبان سیکھنے کی چاروں مہارتیں (سننا، سمجھنا، بولنا اور لکھنا) سکھائی جائیں۔ قواعد رٹنے کا طریقہ ترک کر دیا جائے اور طریق مباشر و تطبیق کو ملا کر پڑھایا جائے۔

۴۔ قرآن حکیم کو تدریس میں وافر حصہ دیا جائے۔ لفظی ترجمے کے ساتھ تحلیلی و تحقیقی مطالعہ، قدیم و جدید تفسیریں داخل نصاب ہوں۔

۵۔ مطالعۂ حدیث میں آخری سال میں مرور سریع کی بجائے مطالعہ حدیث کا تحقیقی مطالعہ کئی سالوں پر پھیلا دیا جائے اور حجیت حدیث کو شامل نصاب کیا جائے۔

۶۔ فقہ و اصول فقہ میں تقابلی مطالعے کو ترجیح دی جائے یعنی آئمہ اربعہ، اہل ظاہر اور شیعی فقہ کا تقابلی مطالعہ بھی شامل نصاب ہو۔ اسی طرح مغربی اور انگریزی قانون بلکہ بعض بین الاقوامی قوانین اور پاکستانی آئین و قوانین کا مطالعہ بھی شامل نصاب ہو۔ قرآن و حدیث کی تدریس ہرگز فقہی بنیادوں پر نہ کی جائے۔

۷۔ اسلامی تاریخ و جغرافیہ، اسلامی فکر و تہذیب، اسلامی معاشیات، اسلامی سیاسیات، تقابل ادیان، اسلام اور جدید مسائل اور اسلام اور مغربی فکر و تہذیب جیسے نئے مضامین داخل نصاب کیے جائیں۔

۸۔ مذکورہ بالا مضامین کے عصری مباحث انگریزی زبان میں پڑھائے جائیں اور انگریزی زبان

☆ ان ڈگریوں کے وہ اپنے نام رکھ سکتے ہیں۔

کے فنکشنل استعمال اور بطور علمی و دعوتی زبان کے اس کا مزید مطالعہ بھی ساتھ جاری رکھا جائے۔

۹۔ بڑے دینی مدارس عالیہ کے بعد جدید یونیورسٹیوں کی طرز پر اسلامی علوم میں تخصص و تحقیق کا عمل جاری رکھیں اور دو سال میں ایم فل اور مزید تین سال میں پی ایچ ڈی کروائیں☆ اس غرض سے وہ حکومتوں سے باقاعدہ یونیورسٹی چارٹر بھی لے سکتے ہیں اور موجودہ یونیورسٹیوں کے ساتھ مل کر بھی کام کر سکتے ہیں۔

۱۰۔ معاشرے میں مسلک پرستی اور فرقہ واریت کا زور توڑنے کے لیے اگر دینی مدارس یہ کر سکیں تو بہت اچھا ہو کہ دینی تخصص میں داخلہ مسلک کی بنیاد پر نہ دیا جائے اور نہ اساتذہ کا تقرر مسلک کی بنیاد پر کیا جائے۔ **وتلک عشرہ کاملة**

دیگر تخصصات

ا۔ دینی عناصر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دیگر علوم خصوصاً سوشل سائنسز (معاشیات، سیاسیات، تعلیم، فلسفہ، نفسیات، قانون وغیرہ) اور نیچرل سائنسز (فزکس، کیمسٹری، بیالوجی وغیرہ) کی اسلامی تناظر میں تدوین نو کریں۔ فی الوقت یہ علوم مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کے پس منظر میں وضع کئے گئے ہیں او مسلم طلبہ کے لیے بالکل غیر موزوں ہیں۔ یہ انہیں مغربی فکر و تہذیب سے مرعوبیت سکھاتے اور انہیں ذہنی غلام بناتے ہیں اور ان سے اسلام پر ان کی یکسوئی میں خلل پڑتا ہے جس سے مسلم شخصیت غیر مستحکم ہوتی ہے اور بے کرداری جنم لیتی ہے۔ علماء کرام کو حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرانی چاہیے اور اگر وہ کچھ نہ کرے (جیسا کہ توقع ہے) تو دینی عناصر کو اس کام کے لیے ایک بڑا تحقیقی مرکز خود قائم کرنا چاہیے۔

خلاصۂ بحث

دینی مدارس کو موجودہ حالات میں اپنے طلبہ کو مروجہ عصری تعلیم اور اسناد دینے اور دلانے کا کام نہیں کرنا چاہیے بلکہ انہیں تعلیمی ثنویت ختم کرنے کا اعلان کرنا چاہیے اور عصری تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے اور اگر وہ متحد و منظم ہو کر یہ جدوجہد کریں تو یہ ان شاء اللہ کامیاب ہو سکتی ہے۔ جب تک حکومت اصلاح نہیں کرتی اس وقت تک خود دینی عناصر اور علماء کرام کو عصری تعلیم کو اپنی ذمہ داری سمجھنا چاہیے اور اسلامی تناظر میں اس کی اصلاح کر کے اسے مسلمان عوام کو مہیا کرنا چاہیے اور سکول و کالج قائم کرنے چاہئیں۔ اسی طرح دینی مدارس میں دین کی تخصصی تعلیم بھی اصلاح کی متقاضی ہے اور اسے مؤثر بنانے کے لیے اس پر نظر ثانی ناگزیر ہے۔ ان سب امور کے لیے جو تبدیلیاں درکار ہیں ہم نے ان کی طرف اختصار سے اشارہ کر دیا ہے۔ کاش علماء

کرام ان امور پر غور فرمائیں۔

محمد عاصم حفیظ

مدارس میں میڈیا کی تعلیم

وقت کی ایک اہم ضرورت

آج کے ترقی یافتہ دور میں میڈیا کی اہمیت مسلم ہے۔مختلف قسم کے ذرائع ابلاغ نے ٹیکنالوجی کے سہارے اس وسیع وعریض کرہ ارض کو ایک گلوبل ویلج میں بدل کے رکھ دیا ہے۔میڈیا نے انسان کو ہر ہر لمحے باخبر رکھنے میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔آج کے دور کا اہم ترین مسئلہ معلومات کی قلت نہیں بلکہ بے پناہ معلومات کے سمندر نے انسانوں کو فکری پریشانیوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔آج کے میڈیا کا سب سے بڑا استعمال ذہن سازی اور مخصوص مقاصد کے لئے کیا جانیوالا پروپیگنڈا ہے۔میڈیا کے شوروغل نے سچ اور جھوٹ کی پہچان مشکل بنا دی ہے۔ مباحثوں ،خبروں اور دلکش پروگراموں کے ذریعے فکر،سوچ اور ذہن کو مسخر کیا جاتا ہے۔ملکی اور غیر ملکی میڈیا کی بھرپور یلغار کی بدولت آج ہمیں پاکستان کے اسلامی معاشرے میں فحاشی وعریانی ،رقص وسرور اور سب سے بڑھ کر لادینی جیسی لعنتوں کا سامنا ہے۔ ہندووانہ رسومات عام ہو رہی ہیں جبکہ ہماری ثقافتی روایات روبہ زوال ہیں۔میڈیا کے منفی کردار نے ہی آج پاکستانی نوجوانوں کو مغربی تہذیب کا دلدادہ بنایا ہے۔بوڑھوں کے نصیب سے مساجد اور عبادات کی لگن چھینی ہے۔ بچوں کو ہندووانہ رسم ورواج سے آشنا کرایا ہے جبکہ حکمرانوں کو روشن خیالی کا درس دیا ہے۔آج کے دور میں میڈیا سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں ہے۔میڈیا سے آگاہی کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے۔اگر ہم معاشرتی ترقی کی منزل پانا چاہتے ہیں تو میڈیا سے ہمقدم ہوتے ہوئے اس بے قابو جن سے دوستی کرنا ہوگی۔ میڈیا کو اپنی معاشرت وروایات سے ہم آہنگ کرنے کے لئے بھرپور تیاری کی ضرورت ہے۔ذرائع ابلاغ کے کردار وعمل سے آگاہی کے لئے نصاب تعلیم میں ان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔کس طرح میڈیا معاشروں کو بدلتا ہے، پروپیگنڈا کے رائج طریقوں اور دوسرے اصول وضوابط کا علم ہی لوگوں کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

دوسرے بہت سے مضامین کی طرح ذرائع ابلاغ کے بارے میں بنیادی علم کو بھی مدارس دینیہ کے نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہی وہ طبقہ ہے جس نے صرف اور صرف رضائے الٰہی کی خاطر خود کو دین کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔دین حنیف کی اشاعت اور معاشرے

میں اسلامی روایات کے فروغ کے لئے صرف پاکستان میں ہی لاکھوں بچے دینی مدارس کا رخ کرتے ہیں۔آج کے دور میں دینی تعلیم کی طرف راغب ہونا کوئی آسان بات نہیں ۔حکومتوں کے سفاک رویے اور مخالفانہ پروپیگنڈے کی بھرمار کے باوجود آج بھی ایسے افراد کی کمی نہیں جو دنیاوی عیش و عشرت کو ٹھکرا کر منبر و محراب کے وارث بننے پر فخر محسوس کرتے ہیں ۔ دینی مدارس کا رخ کرنے والوں کا مقصد اللہ تعالی کی خوشنودی کی خاطر اپنی صلاحیتوں کو وقف کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسے مخلص اور بے لوث طبقے کو ابلاغیات کے جدید اصول وضوابط سے آگاہی حاصل ہو کہ جن کو استعمال کر کے دعوت دین کے کام کو مزید مؤثر بنایا جا سکے ۔ ابلاغ کا علم دعوت دین کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوسکتا ہے اور دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہونیوالے طلبہ میڈیا کے بارے میں جان پہچان ہونے کی وجہ سے معاشرے میں بہتر کردار ادا کر سکتے ہیں ۔میڈیا کی یلغار ہی وہ سب سے بڑا چیلنج ہے کہ جس نے معاشرے کے دیگر طبقات کی طرح مدارس دینیہ کے طلبہ وطالبات کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے ۔آج کے بچے کم سنی سے ہی گھنٹوں الیکٹرانک میڈیا سے مستفید ہوتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ وہ میڈیا کے استعمال کا بھرپور شعور رکھتے ہیں ۔تفریح کے نام پر ہماری نسلوں کو بدلا جا رہا ہے۔اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کی واحد صورت ان معصوم ذہنوں کو تفریح کے نام پر ہونے والے پروپیگنڈے سے آگاہ کرنا ہے ۔ نصاب میں میڈیا سے متعلقہ مضمون شامل نصاب ہونے کی صورت میں یہ طلبہ خود کو مغربی و ہندو ثقافت کی یلغار سے بہتر طریقے سے محفوظ کرسکیں گے اور غیر ملکی پروپیگنڈے اور دھوکے کی سازش کے بارے میں کم از کم آگاہی ضرور حاصل کرلیں گے ۔

ہر امتحان کی تیاری سے ہی کامیابی ممکن ہوتی ہے ۔کسی بھی مشینری یا ٹیکنالوجی کا استعمال جانے بغیر اسے مصرف میں لانا ہمیشہ خطرناک نتائج کا باعث بنتا ہے ۔میڈیا بھی ایک ٹیکنالوجی کی مانند ہے جسے استعمال کرنے سے پہلے اس کی بنیادی باتوں کا علم ہونا ضروری ہےُ ۔میڈیا کے بہتر استعمال کے لئے ماہرین سے رائے طلب کی جائے جو عام لوگوں کو میڈیا کا بہتر طریقے سے استعمال سکھائیں ۔ مثالوں اور حقائق کے ذریعے پروپیگنڈے سے بچنے کا ہنر عام کیا جائے ۔ اسی طرح مدارس کے اساتذہ کے لئے ورکشاپس اور سیمینارز کا اہتمام کیا جانا چاہیے کہ جہاں انہیں ذرائع ابلاغ کے چیلنج سے آگاہ کیا جائے ۔ جی ہاں! ہمیں اپنا معاشرہ بچانے کے لئے یہ سب کرنا ہوگا ۔

۔ میڈیا کو برائی کی جڑ قرار دینے کی باتیں تو بہت ہوچکیں ، اب ہمیں چاہیے کہ اس ٹیکنالوجی کو دعوت دین کے لئے استعمال کرنے کی تدبیر کریں ۔ اگر مدارس کے طلبہ اور دینی شعور رکھنے والے افراد پیشہ ورانہ طریقے سے میڈیا کو دینی تبلیغ کرنے کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیں تو یقینا فحاشی وعریانی اور کفر و الحاد کی یلغار کو کسی حد تک روکا جا سکتا ہے اور اگر ہماری ہمت جواب نہ دے تو معاشرتی تباہی

پھیلاتے اس میڈیا کو اسلامی ثقافت و روایات کا امین بھی بنایا جا سکتا ہے۔ہمیں اپنی نوجوان نسل کو بتانا ہوگا کہ کیسے تفریح اور غیر جانبداری کی آڑ میں گمراہی پھیلائی جاتی ہے ۔ان غیر ملکی چینلز کے اصل کردار اور مقاصد سے آگاہ کرنا ہو گا جو مخصوص ایجنڈے کی تکمیل میں مصروف ہیں اور ہمارے معاشرے پراثرانداز ہورہے ہیں ۔

کیسے اورکس طرح خفی پیغام معاشروں کے بدلنے میں کردار ادا کرتے ہیں ۔ ابلاغ عامہ کے مختلف نظریات اوراس شعبے میں ہونے والی تحقیق آسان الفاظ میں سب کو بتانے کی ضرورت ہے ۔ یہ سب اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے لوگ صرف معصوم صارف ہی بن کر نہ رہ جائیں اور یہ بھی کہ غیر لوگ ان کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال نہ کرسکیں ۔میڈیا کے مندرجات کو سمجھنے والے ہی مخالف پروپیگنڈے سے محفوظ رہ سکتے ہیں ۔اوراس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ کفار وسیکولر ذہنوں سے مقابلے کے لیے ہمارے ہراول دستے یعنی مدارس دینیہ کے طلبہ کو یہ ہنر سیکھنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ملکی اورغیر ملکی میڈیا سے استفادہ ہرگز بری چیزنہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے ہوشمندی سے کام ضرور لینا چاہیے تا کہ آپ کو دھوکہ نہ دیا جا سکے۔ہمیں اپنے معاشرے کو اتحاد ویکجہتی کے رشتے میں پرونے اور اسلامی روایات کے فروغ کے لئے میڈیا کی مدد چاہیے ۔اسی لئے میڈیا کے علم کو شامل نصاب کرنا ضرور ہے ۔ٹیکنالوجی کے اس ترقی یافتہ دور میں ہمیں اب کمیونٹی جرنلزم کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے ۔چھوٹے پیمانے پر ہونے والی یہ صحافت ہی وہ اصل طاقت ہے جو معاشرتی تبدیلی لاتی ہے۔کیبل کے پھیلاؤ کے باعث شہروں کے ٹی وی چینلز سامنے آرہے ہیں جبکہ ایف ایم ریڈیوز بھی کمیونٹی جرنلزم کی ہی مثال ہیں۔اس مقصد کے لئے ایسے باشعور افراد کی ضرورت ہے جو بہتر طریقے سے اپنی کمیونٹی کی نمائندگی کرسکیں ۔ چھوٹے پیمانے پر ہونے والی اس صحافت کا مواد بھی عام شہری ہی فراہم کرتے ہیں ۔ اگر ہمارے طلبہ مدارس میں میڈیا کے استعمال سے آگاہ ہوں گےتو ان کے لئے یہ سب کرنا آسان ہوگا ۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بلکہ دوران تعلیم ہی یہ طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ میڈیا کو اسلامی نہج پر چلانے کے لئے اپنا حصہ ڈال سکیں۔کسی بھی عالمی یا ملکی مسئلہ پر اسلامی نقطہ نظر کو واضح کرسکیں گے ۔ پرنٹ ،کمیونٹی ، براڈ کاسٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر اپنی رائے دینے کے قابل ہو جائیں گے۔

اسی طرح ابلاغ عامہ کے ماہرین کو بڑے مدارس کے سٹاف میں شامل کرنے کی ضرورت ہے تا کہ طلبہ و طالبات میں حالات حاضرہ کے بارے میں شعور بیدار ہو۔کسی بھی اہم ملکی یا غیر ملکی مسئلہ پر یہ لوگ طلبہ کو معلومات فراہم کریں ۔میڈیا کے مندرجات اور ان کے اثرات سے آگاہ کریں ۔ طلبہ کو ملکی مسائل پر لکھنے اور اپنے رائے دینے کا ہنر سکھائیں ۔صرف اسی طرح طلبہ کو قومی و عالمی

معاملات سے آگاہ رکھا جا سکتا ہے جو ان میں یقینا بہتر تبدیلیاں پیدا کرے گا۔

مدارس میں میڈیا کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلبہ و طالبات سب سے زیادہ سوشل میڈیا کو استعمال کر سکتے ہیں جو انتہائی سستا اور تیز ترین ذریعہ ہے۔ سوشل میڈیا ذرائع ابلاغ کی ایک نئی قسم ہے۔ موبائل اور انٹرنیٹ ٹیکنالوجی میں تیز رفتار ترقی کی بدولت پیغام رسانی انتہائی آسان ہو چکی ہے اور دنیا بھر میں ہونے والے کسی بھی واقعے کی خبر چند سیکنڈز کے اندر آپ تک پہنچ جاتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کی ان نئی اقسام نے معاشرے میں اثرات اور معلومات کی فراہمی کے حوالے سے پرنٹ، الیکٹرانک اور براڈ کاسٹ میڈیا کو کافی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ موبائل فون اب ہر شخص کی ضرورت بنتا جا رہا ہے۔ یہ ہر وقت آپ کے ساتھ ہوتا ہے اور اسی لئے تیز ترین رسائی کا ذریعہ بھی ہے۔ ٹی وی یا ریڈیو تو تب ہی ابلاغ کا کام کر سکیں گے کہ جب آپ اس جگہ جہاں یہ آلات موجود ہوں جائیں اور چلا کر اہتمام سے دیکھیں یا سنیں، اسی طرح اخبار سے مستفید ہونے کے لئے بھی اس کو خریدنے اور بغور پڑھنے کا مرحلہ آتا ہے۔ سوشل میڈیا کا دائرہ کار اس حوالے سے کافی وسیع ہے۔ یہ تو ہر وقت آپ کے ہاتھ میں موجود موبائل فون کے ذریعے معلومات فراہم کرتا ہے جب کہ انٹرنیٹ کی سہولت بھی اب زیادہ تر موبائل فونز پر موجود ہے۔ سوشل میڈیا معلومات کی فراہمی میں دیگر ذرائع ابلاغ سے سبقت رکھتا ہے جبکہ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اسے اپنی پسند کے مطابق استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سوشل میڈیا کے حوالے سے میڈیا کی تعلیم سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ایک انتہائی طاقتور ہتھیار ہے جیسے نادان ہاتھوں میں نہیں دیا جا سکتا۔ نوجوانوں میں اس حوالے سے شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کی بنائی ہوئی ویڈیو یا تصویر کہاں تک پہنچ سکتی ہے اور اس کے ذریعے کیا کیا مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ موبائل فون کے ذریعے ویڈیو بنا کر بلیک میل کیا جاتا ہے۔ اس لئے اگر بچوں کو موبائل ویڈیو کے اثرات سے آگاہ نہ کیا گیا تو مستقبل میں تباہ کن نتائج نکل سکتے ہیں۔ مذاق مذاق میں بنائی گئی ویڈیو کسی کی زندگی بھی لے سکتی ہے یا پھر کسی عزت دار گھرانے کو بدنام کیا جا سکتا ہے۔ اکثر اوقات شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں موبائل کیمرہ کا کثرت سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نوجوانوں کو اس بارے میں آگاہی دینے کی ضرورت ہے کہ یہ سب کس طرح ان کی زندگی کو متاثر کر سکتا ہے۔ اور یہ سب تبھی ممکن ہے جب تعلیمی اداروں میں ان موضوعات کو زیر بحث لایا جائے۔

دینی مدارس کے طلبہ بھی میڈیا کی اس صورت کو استعمال میں لا سکتے ہیں۔ ان کو پتہ ہونا چاہیے کہ ویڈیو کلپس کی کیا اہمیت ہے اور ان سے کیا کیا تبلیغی و دینی مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ خوبصورت تلاوت، نظم، رنگ ٹونز، نصیحت آموز موبائل کلپس کو عام کرنے سے معاشرے میں مثبت اثرات

مرتب کئے جا سکتے ہیں۔اسی طرح اچھے مطالعے اور بولنے کی صلاحیت رکھنے والے طلبہ کو چاہیے کہ وہ الیکٹرانک میڈیا اور براڈ کاسٹ میڈیا کی طرف توجہ دیں۔آجکل تقریبا تمام بڑے شہروں میں مقامی ایف ایم ریڈیو سٹیشنز موجود ہیں۔ان کے پروگرامز مقامی طور پر ہی تیار ہوتے ہیں۔مدارس کے طلبہ ایف ایم ریڈیو کے لئے پروگرام تیار کر سکتے ہیں جو لوگوں کی ایک بڑی تعداد سنے گی۔اسی طرح سی ڈی چینلز کو بھی دعوتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔مدارس کے اندر ہونے والے مباحثوں اور اہم مسائل پر علمائے کرام کی تقاریر کو سوشل میڈیا کے ذریعے عام کرنا چاہیے تا کہ معاشرے کے دیگر طبقات کو علم ہو سکے کہ دینی طلبہ کے اندر کس قدر صلاحیت موجود ہے۔ ویب سائٹس پر فورم، بلاگس، سوشل نیٹ ورکنگ، ویب سائٹس غرض بے شمار سہولیات موجود ہیں جنہیں استعمال کر کے دعوت دین کو بڑے پیمانے پر لوگوں میں پھیلایا جا سکتا ہے۔ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب طلبہ کو یہ سب سکھایا جائے۔ پرنٹ میڈیا میں تو دینی مدارس کے طلبہ کے لئے بے شمار مواقع موجود ہیں۔ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ مواد کو مکمل پیشہ ورانہ طریقے سے تیار کیا جائے۔دینی رسائل، اخبارات کے دینی ایڈیشنز، کالم، ایڈیٹر کے نام خط کی صورت میں دینی طلبہ اپنی تحریریں شائع کرا سکتے ہیں۔اسی طرح اگر مدارس میں میڈیا کی تعلیم دی جائے تو دینی رسائل کے لئے بھی اچھا مواد مل سکے گا اور روایتی طرز سے ہٹ کر ایسا مواد سامنے آئے گا جو معاشرے کی بڑی تعداد کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوگا۔

اگر ملک کے ایسے بڑے دینی مدارس جہاں سینکڑوں طلبہ زیر تعلیم ہیں ان میں سے ہر مدرسہ سال میں اگر چار پانچ ایسے نوجوان بھی سامنے لا سکے جو میڈیا کا کافی حد تک علم رکھتے ہوں، انہیں اپنی بات کہنے کا ہنر آتا ہو اور وہ میڈیا پر آ کر اپنا موقف بے دھڑک بیان کر سکیں تو یقینا ہمارے معاشرے میں میڈیا کی تباہ کاریوں میں کمی لائی جا سکتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ آج جب ہم دیکھتے ہیں کہ غیر ملکی میڈیا ہماری معاشرتی، سماجی اور دینی اقدار کو آہستہ آہستہ ختم کر رہا ہے تو ان حالات میں ہمیں آنے والے چیلنجز کا بھرپور تدارک کرنا چاہیے اور ان کے خاتمہ کے لیے کوششیں تیز کر دینی چاہئیں۔نوجوان نسل کو آج فلموں، ڈراموں، اشتہارات، خبروں، انٹرنیٹ حالات حاضرہ کے پروگراموں وغیرہ کے ذریعے ہونے والے پروپیگنڈے سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے اور اس کا بہترین حل ابلاغ عامہ کے علم کو شامل نصاب کر دینا ہے تا کہ ہم اپنی روایات کی حفاظت کر سکیں، ہماری خودمختاری پر آنچ نہ آنے پائے، ہمارے ملک میں اسلامی

☆ یہ اعداد و شمار تخمینی ہیں اور ہمارے معاشرتی مشاہدے پر مبنی ہیں۔ ہمارے علم میں کوئی ایسی تحقیق نہیں جس میں حقیقی سروے وغیرہ کی بنیاد پر اس طرح کی کوئی سٹڈی کی گئی ہو۔

ثقافت وروایات کا بول بالا ہو اور ہم ایک باعزت و باوقار قوم کے طور پر کردار ادا کر سکیں ۔۔

تربیہ مینوئل ڈاکٹر محمد امین

بچوں کی اسلامی تربیت میں سکول انتظامیہ کا کردار (۳)

چند اعتراضات اور ان کے جوابات

سوال: آپ نے کافی تفصیل سے ہمارے سوال کا جواب دیا ہے لیکن معاف کیجئے گا ہمیں دوٹوک انداز میں اس کا جواب نہیں ملا کہ تعلیم میں بزنس کلچر اور اس کے نظریاتی پہلو میں ہم آہنگی کیسے پیدا کی جائے اور موجودہ ماحول میں ان دونوں چیزوں کو ساتھ رکھ کر کامیاب تعلیمی ادارہ کیسے چلایا جائے؟

جواب: آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے معاشرے کے اسلامی، معاشی، سماجی اور تعلیمی حالات کا ایک معروضی جائزہ لیں جو ہمارے مطالعے مشاہدے اور فہم کی حد تک یہ ہے:

۱۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا پاکستانی معاشرہ سماجی اور معاشی لحاظ سے کئی طبقات میں بٹ چکا ہے:

۱۔ بہت امیر ۲۔امیر ۳۔اعلیٰ متوسط طبقہ ۴۔متوسط طبقہ ۵۔نچلا متوسط طبقہ ۶۔غریب ۷۔بہت ہی غریب

۲۔ مغربی اثرات کے قبول و عدم قبول اور دینی تعلیمات و اقدار پر عمل و عدم عمل کے حوالے سے بھی پاکستانی معاشرہ کئی طبقات میں تقسیم ہو چکا ہے☆

	مغربی تہذیب کی قبولیت		اسلامی اثرات
۔ بہت امیر طبقہ	%90		%10
۔ امیر طبقہ	%80		%20
۔ اعلیٰ متوسط طبقہ	%65		%35
۔ متوسط طبقہ	%50		%50
۔ نچلا متوسط طبقہ	%40		%60
۔ غریب	%30	لاتعلقی 40%	%30

۔ بہت غریب لاتعلقی ٪60 %20 %20

اس تقسیم پر تبصرے کے حوالے سے ہمارے دو ملاحظات ہیں:

i۔ ایک چیز جو ان سب طبقات میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے وہ یہ کہ ہر سطح کا نچلا طبقہ چھلانگ لگا کر اوپر کے طبقے میں شامل ہونا چاہتا ہے اور یہ چھلانگ نہ صرف معاشی ہوتی ہے بلکہ دینی اور معاشرتی بھی ہوتی ہے یعنی نچلے طبقے کا فرد جب معاشرتی لحاظ سے اوپر کے طبقے میں شامل ہوتا ہے تو اس طبقے کے معاشرتی اور دینی رویے بھی اپنا لیتا ہے۔ بالفاظ دیگر آپ کہہ سکتے ہیں ان میں مغربی تہذیب کی قبولیت کا تناسب بڑھتا اور دینی تعلیمات و اقدار پر قائم رہنے کا تناسب کم ہوتا جاتا ہے۔

ii۔ غریب اور امیر طبقات کا تصور دین زیادہ تر ''روایتی'' ہے شعوری اور حقیقی نہیں مثلاً غریب آدمی نماز پڑھ کر اور روزے رکھ کر سمجھ لیتا ہے کہ پورے دین پر عمل ہوگیا۔ اسی طرح امیر طبقہ نماز پڑھ کر یا مسجد و مدرسہ کی تعمیر میں چندہ دے کر سمجھتا ہے کہ اس نے دین کا حق ادا کر دیا جب کہ متوسط طبقے کا دین و ایمان کچھ شعوری بھی ہوتا ہے، وہ دین کا کچھ مطالعہ بھی کرتا ہے اور دینی حوالے سے عصری تقاضوں کا بھی کچھ ادراک رکھتا ہے چنانچہ یہی طبقہ اکثر و بیشتر جدید دینی تحریکوں اور اداروں کا حصہ بنتا ہے۔

۳۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ ہمارے تعلیمی ادارے (بشمول دینی لوگوں کے جدید تعلیم کے ادارے ـــــ الّا ماشاء اللہ) اس وقت اس طرح کی تعلیم دے رہے ہیں جو مغربیت (ویسٹرنائیزیشن) کو قبول کرتی ہے۔ اس کے لئے ان کا بہانہ یا جواز (justification) یہ ہے کہ یہ پبلک کی ڈیمانڈ ہے۔ یہاں چند لمحے رک کر یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ:

۱۔ آیا یہ پبلک کی ڈیمانڈ ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟

۲۔ پبلک کی اس ڈیمانڈ کو پورا کرنے کے طریقے کیا ہو سکتے ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں پبلک کی ڈیمانڈ کسی حد تک موجود ہے لیکن اگر آپ غور کریں تو جان جائیں گے کہ یہ ڈیمانڈ جینوئن نہیں fake ہے: فطری نہیں جعلی (fabricated) ہے اور اسے اہل مغرب نے دنیا پر اپنی ملحدانہ تہذیب کے غلبے اور مسلم معاشروں کو کمزور، محکوم اور اسلام سے دور رکھنے کے مذموم مقاصد سے پروان چڑھایا ہے لہٰذا اس جعلی ڈیمانڈ کو پورا کرنے کی بجائے اسے رد کرنے کی ضرورت ہے اور اگر رد کرنا بوجوہ ممکن نہ ہو تو اس کے امالے کی ضرورت ہے۔

ہم نے سطور بالا میں کچھ عرض کیا ہے وہ چونکہ مجمل ہے لہٰذا اس کی تفصیل ناگزیر ہے:

۔ ڈیمانڈ جینوئن بھی ہوسکتی ہے اور غیر جینوئن بھی۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ تہجد پڑتے ہیں یا فجر کی اذان دیتے ہیں بلکہ عام مسلمانوں کو بھی رمضان میں اس کا تجربہ ہوتا ہے خصوصاً ان کو جو دیہات میں کھلی فضا میں رہتے ہیں اور جو وقت کے لئے شہری لوگوں کی طرح صرف گھڑی پر اکتفا نہیں کرتے کہ صبح صادق سے پہلے صبح کاذب بھی طلوع ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم نے قدرتی طریق علاج پر ایک جرمن ڈاکٹر لوئی کوہنی کی کتاب پڑھی تھی جس میں وہ کہتا ہے کہ جب تک سچی بھوک نہ لگے کھانا مت کھاؤ۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض لوگ بھوک کے کچے ہوتے ہیں اور ہر چند گھنٹے بعد انہیں کھانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ دراصل جھوٹی بھوک (جوع کاذب) ہوتی ہے اور اگر وہ چند گھنٹے مزید نہ کھائیں تو پھر انہیں سچی بھوک لگتی ہے۔

اسی مفہوم میں ہم کہہ رہے ہیں کہ مسلم معاشرے میں مغربی تہذیب سے متاثر و مرعوب نظام تعلیم کی ڈیمانڈ جینوئن نہیں ہے بلکہ لوگ دراصل یہ چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد کو اچھی انگریزی آجائے تاکہ انہیں اچھی ملازمت مل سکے کیونکہ جس کو اچھی انگریزی آتی ہے اسے اچھی ملازمت مل جاتی ہے۔ معاشرے میں اس کی ''ٹور'' یعنی عزت ہوتی ہے۔ یہ اس لئے بھی ہے کہ پاکستان میں دفتری زبان ابھی تک انگریزی ہے، مقابلے کے امتحانوں کی زبان بھی انگریزی ہے اور اسی لئے پاکستان میں انگریزی پہلی جماعت سے لے کر بی اے تک بطور لازمی مضمون رائج ہے اور اکثر پرائیویٹ سکول انگلش میڈیم ہیں۔

انگریزی زبان اور مغرب سے مرعوب و متاثر نظام تعلیم کا مسلم معاشروں خصوصاً پاکستان میں تسلسل سے جاری رہنا کوئی حادثہ نہیں بلکہ یہ مغربی استعمار کی پلاننگ کا ایک حصہ ہے۔ جب مغربی استعمار نے مسلم ممالک پر قبضہ کرلیا تو ہر جگہ اس نے وہاں کا نظام تعلیم ختم کر کے اپنا نظام تعلیم جاری کردیا تاکہ ان کی نسلوں میں خوئے غلامی رچ بس جائے اور وہ سر اٹھانے اور جہاد اور آزادی کا نہ سوچیں۔ پھر جب مغرب مشیت ایزدی کے تحت باہمی جنگوں سے کمزور ہوگیا (جنگ عظیم اوّل و دوم میں) تو وہ مسلم ممالک کو آزادی دینے پر مجبور ہوگیا جب کہ مسلم ممالک میں ہر جگہ آزادی کی تحریکیں بھی چل رہی تھیں لیکن جانے سے پہلے اس نے یہ انتظام کیا کہ نو آزاد ممالک میں حکمران انہی کی مرضی کے رہیں، سول اور فوجی بیوکروکریسی ان کی پسند کی رہے، تعلیمی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام، قانونی نظام ۔۔۔سب میں اسی کی مرضی چلے اور اس کے لئے جو حکمت عملی اس نے اختیار کی اس میں

وہ کامیاب رہا۔ اس لئے ہم کہہ رہے ہیں کہ اگر پاکستان میں انگریزی اور مغرب سے متاثر و مرعوب تعلیمی نظام ہے تو یہ کوئی حادثہ نہیں بلکہ یہ مغرب کی پلاننگ کا نتیجہ ہے۔ اور مغرب کی سرمایہ دارانہ اور تاجرانہ ذہنیت نے اسے یہ سکھایا ہے کہ پہلے ڈیمانڈ پیدا کرو تو مارکیٹ اور بازار کے اصولوں کے مطابق سپلائی کے ذرائع خود بخود حرکت میں آجائیں گے چنانچہ جب استعمار نے ڈیمانڈ یہ پیدا کی کہ ملازمت اسے ملے گی جسے اچھی انگریزی آتی ہوگی تو ایک وقت ایسا آیا کہ مسلمانوں میں سے بعض لوگ اٹھ کھڑے ہوئے کہ یہ ڈیمانڈ ہم پوری کریں گے۔ برصغیر میں اس کے بانی سر سید احمد خان تھے۔

غرض سادہ لوح مسلم عوام تو غلط نظام تعلیم اور غلط نظام حیات کی وجہ سے بیماری کی اصل جڑ کا ادراک ہی نہیں رکھتے وہ تو محض اچھی ملازمتوں اور اچھے روزگار کے متلاشی ہیں۔ اہل مغرب کی ہوشیاری یہ ہے کہ انہوں نے ملازمتوں کے اس نظام کو ابھی تک انگریزی اور انگریزی نظام تعلیم سے باندھا ہوا ہے۔ آج انگریزی کو اس مقام سے ہٹا کر اردو اور اسلامیات کو اس کی جگہ دے دیں تو لوگ انگریزی چھوڑ کر اردو اور اسلامیات پڑھنے لگیں گے۔ جامعہ رحمانیہ لاہور کے مولانا حافظ عبدالرحمن مدنی بتاتے ہیں کہ جب جنرل ضیاء الحق نے عدالتی نظام کو اسلامی بنانے کی کوشش کی اور قاضی کورٹس بنانے کا اعلان کیا تو ہم نے قاضی کلاسیں شروع کر دیں۔ پہلے گروپ میں چند لوگ آئے، دوسرے میں درخواستوں کی تعداد سیکڑوں اور تیسرے میں ہزاروں تک پہنچ گئی اور وزیروں کے سفارشی فون آنے لگے اور ہم نے فضلاء کے لئے سعودی عرب کی ایک جامعہ سے بات کر کے کچھ تربیت کا وہاں انتظام بھی کر لیا۔ لیکن جب قاضی کورٹس عملاً نہ بنیں تو لوگوں کا رجحان بھی نہ رہا۔ اور اب وہی جامعہ رحمانیہ ہے اور وہی حافظ مدنی ہیں لیکن نہ کوئی قاضی کلاس وہاں ہوتی ہے اور نہ کوئی قاضی کلاس میں داخلہ لینے والا ہے۔ تو خلاصہ یہ کہ انگریزی اور انگریزی نظام تعلیم کی جعلی ڈیمانڈ انگریز نے پیدا کی ہے۔

اس کا حل کیا ہے؟ اگر مسلم عوام و خواص کو اس مرض کا ادراک ہو جائے تو اس نظام کو بدلا جا سکتا ہے لیکن جن لوگوں نے سیاسی جدوجہد کے ذریعے اس نظام کو بدلنے کی کوشش کی انہیں بوجوہ اس میں ناکامی ہوئی (جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں) چنانچہ اب اس نظام کو اگر ہم ختم نہیں کر سکتے، اس کا ازالہ نہیں کر سکتے تو اس کی اصلاح اور امالہ تو کر سکتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ معاشرہ کے ذہین، اسلامی اور مخیر عناصر مل کر ایسے تعلیمی ادارے قائم کریں جن میں انگریزی تو اچھی ہو لیکن

انگریزی کلچر کا غلبہ نہ ہو۔ سوشل سائنسز ایسے پڑھائی جائیں کہ اس میں مغربی علم کے ساتھ اسلامی علم اور روح بھی ان میں موجود رہے۔ یہ کام ہوسکتا ہے اور حکومت کی مدد کے بغیر بھی ہوسکتا ہے لیکن اس کے لئے ایسے ذہن کی ضرورت ہو جو محض تاجرانہ نہ ہو بلکہ مذکورہ اصلاح اور امالے کے لئے مخلص اور کمٹڈ ہو اور وہ کوشش کرے کہ Compromises کم سے کم ہوں اور اسلامی مقاصد بھی حاصل ہوجائیں۔

پاکستانی معاشرے کی طبقاتی تقسیم کے تناظر میں اس کام کی حکمت عملی یہ ہوسکتی ہے:

- جہاں تک غریبوں کے لئے تعلیمی اداروں کا تعلق ہے تو چونکہ وہ مالی طور پر محتاج ہیں اور اسلامیت کے بھی مخالف نہیں لہٰذا معاشرہ اور اسلامی NGOs منظم ہوکر مطلوبہ اسلامی تعلیم کا انتظام کرسکتی ہیں مطلب یہ کہ یہاں بڑی حد تک کلی اصلاح ممکن ہے۔
- متوسط طبقے کے لئے تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں جن میں انگریزی تو بہت اچھی ہو لیکن انگریزی نظام کی شیطانی روح اس میں موجود نہ ہو۔ یوں یہاں compromises کو minumum یعنی کم سے کم کیا جاسکتا ہے۔ ایسے ایک ادارے کے خدوخال نیچے دیے جارہے ہیں:
- امیروں کے لئے ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں جہاں ان compromises کو مجبوراً قبول کرلیا جائے لیکن اگر اخلاص نیت اور کمٹمنٹ ہو تو موزوں نصاب، اساتذہ اور تعلیمی ماحول کے ذریعے ایسے حالات پیدا کئے جاسکتے ہیں کہ ان اداروں سے نکلنے والے طلبہ بھی معاشرے کے اسلامی آئیڈیلز سے دور نہ ہوں بلکہ انہیں سمجھتے ہوں، ان سے ہمدردی رکھتے ہوں اور ان میں سے کچھ ایسی سعید روحیں بھی نکل آئیں گی جو سو فیصد حق کو قبول کرلیں اور اسلام کے حق میں توانا آواز بن کر کھڑی ہوجائیں۔ اس طرح کے مجوزہ سکول کا مختصر خاکہ بھی آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمائیں۔

متوسط طبقے کے لئے امالے کے اصول پر مجوزہ سکول کے خدوخال

۱۔ اس تعلیمی پراجیکٹ کو کامیاب بنانے کی پہلی ضرورت اخلاص اور کمٹمنٹ کی ہے یعنی محض پیسے کے لئے اپنے اسلامی اور تعلیمی اہداف سے ہٹنا نہیں بلکہ اصلاح کے لیے ڈٹے رہنا ہے۔

۲۔ دوسری شرط کوالٹی کی ہے کہ آپ عملاً کوالٹی ڈیلیور کریں محض نعرے نہ لگائیں۔ اس مجوزہ سکول میں کوالٹی کیسے آسکتی ہے؟ اس کے لئے چند تجاویز درج ذیل ہیں:

i۔ سکول خوبصورت اور صاف ستھرا ہو۔ پھول، پودے، گملے، درخت، کیاریاں اور روشیں ہوں۔ کمروں میں رنگ و روغن ہو چکا ہو۔ فرنیچر پالش شدہ ہو ٹوٹا ہوا نہ ہو۔

ii۔سکول میں نظم و ضبط ہو، ہڑبونگ اور شور شرابا نہ ہو۔سکول کے سارے پروگراموں میں وقت کی پابندی کی جائے۔

iii۔ اساتذہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اورٹرینڈ ہوں (اگر کوئی ڈگری نہ ہوتو سکول خود ان کی ٹریننگ کرے) یعنی انہیں پڑھانے کافن آتا ہو۔وہ مہذب ہوں،طلبہ کو مار پیٹ اور سختی نہ کریں، گالی نہ دیں۔ اساتذہ کو معقول معاوضہ ملنا چاہیے تاکہ وہ مایوس اور بددل نہ ہوں۔

iv۔ ماہانہ اور سہ ماہی ٹیسٹ لئے جائیں جن کا نتیجہ والدین کوبھجوایا جائے۔اس کے علاوہ بھی والدین سے رابطہ رکھا جائے۔

v۔ طے شدہ فیس کے علاوہ والدین سے حیلے بہانے پیسے نہ بٹورے جائیں۔

vi۔بچے خوداوران کا یونیفارم صاف ستھرا ہو۔

vii۔ہوم ورک باقاعدگی سے چیک کیا جائے (بہتر یہ ہے کہ سکول ہی میں کروادیا جائے تاکہ بچوں کو ٹیوشن سنٹر نہ جانا پڑے)

viii۔تعلیمی معیار بہت اونچا ہو۔ٹارگٹ یہ ہونا چاہیے کہ بچے بورڈ کے امتحان میں پوزیشن لیں یا کم از کم سارے فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوں۔

ix۔بچوں کی انگریزی (خصوصاً ادائیگی الفاظ) بہت اچھی ہونی چاہیے، اتنی اچھی کہ وہ انگلش میڈیم سکولوں سے بہتر ہو یا کم ازکم ان کے مقابلے کی ہو۔

x۔بچوں کوتقریر کی پریکٹس کرائی جائے اور انہیں بیت بازی اور مباحثوں میں شریک کیا جائے تاکہ سکول کے بچے مقامی اورضلعی تقریری مقابلوں میں جیتیں اور انگلش میڈیم سکولوں کو ہرائیں۔

xi۔بچوں کوٹوراور پکنک پر لے جایا جائے اورانہیں تاریخی اورمشہور مقامات کی سیر کرائی جاے۔

xii۔سکول مندرجہ بالا نتائج تبھی دے سکتا ہے جب اس کا سربراہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اورتجربہ کار ہو اور سکول کا وژن اوراسے بلندیوں پر لے جانے کا مشن ہمہ وقت اس کے سرپرسوار رہے۔

ہم یقین اور دعوے سے کہتے ہیں کہ اگرکوئی سکول ان باتوں پرعمل کرے اوران اقدامات سے جواچھے نتائج نکلنے چاہئیں، وہ نکال کر دکھائے تو اسے طلبہ اورفیسوں کی کمی کی شکایت نہیں رہے گی اور اصل مقصد بھی حاصل ہوجائے گا خواہ سکول انگلش میڈیم نہ ہواورآکسفورڈ کی کتابیں نہ ہوں۔۔۔

اسلامی تربیت کے لئے املے کے اصول پر امیروں کے سکول کے خدوخال

ا۔اگراخلاص،کمٹمنٹ اورصحیح سمت میں کوششوں میں تسلسل ہوتو انگلش میڈیم،آکسفورڈ کی کتابوں،او

اوراے لیول کے باوجود بھی اچھے نتائج نکل سکتے ہیں۔

۲۔کوالٹی ناگزیر ہے جس کے لئے اساتذہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، ٹرینڈ اوراچھی تنخواہ کے حامل ہونے چاہئیں۔ مطلوبہ اسلامی ذہن کے اساتذہ اگر مارکیٹ سے نہ ملیں تو سکول انتظامیہ کو ذہین اور اسلامیت کو قبول کر سکنے والے تازہ فضلاء (Fresh Graduates) لے کر خود ان کی تربیت کرنا چاہیے۔

۳۔نصاب میں سکول اپنی طرف سے کچھ اضافی چیزیں پڑھا سکتا ہے۔ اس کے لئے ہر کلاس کے نصاب اور طلبہ کی ذہنی و تعلیمی استعداد کو سامنے رکھ کر مواد تیار کرنا ہوگا۔ یہ کام بعض جگہوں پر ہورہا ہے اس لئے اس طرح کا تیار مواد بھی مل سکتا ہے لیکن اس کے حصول اور مقامی ضروریات کے مطابق اسے Tailor کرنے کے لئے سکول انتظامیہ کو محنت کرنا ہوگی۔ (یہ مواد کہاں سے مل سکتا ہے۔ اس کے لئے رہنمائی اس ہینڈ بک میں دوسری جگہ موجود ہے)۔

۴۔ یہ کلیہ ذہن میں رہے کہ اگر استاد اچھا اور موزوں ہو تو وہ نصاب کی خامی اور کمی آسانی سے دور کرسکتا ہے خواہ اضافی نصابی مواد نہ بھی موجود ہو۔ استاد کی تربیت کرتے وقت اس کے ذہن نشین کردیا جائے کہ وہ مدرس (teacher) نہیں مربی (mentor) ہے۔

۵۔سکول میں انتظامیہ ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں کے ذریعے ایسا ماحول پیدا کرسکتی ہے جس میں بچوں کی اسلامی تربیت ہو (یہ ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیاں کیا ہوسکتی ہیں؟ اس کی تفصیل اس تربیتی ہینڈ بک میں دوسری جگہ موجود ہے)۔

۶۔ انگلش میڈیم میٹرک میں بہت اچھی نصابی کتب موجود ہیں۔ او اور اے لیول میں بھی اسلامک سٹڈیز موجود ہے اور اگر اس مضمون کا استاد اپنے مضمون کا ماہر اور اس سے لگن رکھنے والا ہو، تو وہ بہت کام دکھا سکتا ہے۔ اگر لوگ اسلامیات سے الرجک ہوں تو 'ethics' کے عنوان سے ڈسپلن رکھ کر بالواسطہ طور پر اسلامی اخلاقیات کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔

ہم یقین سے کہتے ہیں کہ اگر امیروں کے سکول کی انتظامیہ اسلامی اہداف حاصل کرنے کے لئے مخلص ہو تو وہ ایسا کرسکتی ہے لیکن اس کے لئے کمٹمنٹ اور صحیح سمت میں جدوجہد ضروری ہے۔ جہاں تک سمت (direction)، طریق کار اور حکمت عملی (methodology) کا تعلق ہے تو اس ہینڈ بک میں اس موضوع پر کافی رہنمائی موجود ہے۔

اسلامی تربیت کے لئے سکول انتظامیہ کا طریق کار

ہم شروع میں ذکر کرچکے ہیں کہ طلبہ کی اسلامی تربیت اور شخصیت کی تعمیر کے لئے سکول انتظامیہ کو

جو وسائل (tools) درکار ہیں وہ تین ہیں: ۱۔ نصاب ۲۔ اساتذہ ۳۔ تعلیمی ادارے کا ماحول۔ ان تینوں کے بارے میں اختصار کے ساتھ ذکر سطور بالا میں آچکا، ان کی تفصیل اسی باب میں آگے آرہی

ہم نے معروف مربی، محقق، ادیب اور دانشور جناب احمد جاوید صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ ہمارے ادارے صفاء انسٹی ٹیوٹ میں ''مغربی فکر وتہذیب کا تنقیدی مطالعہ: اسلامی تناظر میں'' کے موضوع پر ایک لیکچر سیریز شروع کریں۔ ہمیں خوشی ہے کہ انہوں نے ہماری درخواست قبول فرمائی اور اس سلسلے میں ۱۴ مئی ۲۰۱۱ء کو پہلا لیکچر دیا۔ یہ لیکچر تحریری صورت میں حاضر خدمت ہے۔ لیکچر کے بعد، جو سوال وجواب ہوئے ان میں سے بھی بعض اہم یہاں دے دیے گئے ہیں۔ امین

ہے لہٰذا ہم یہاں موضوع کو مکمل کرنے کی خاطر بعض اشارات پر اکتفا کریں گے:

نصاب

۱۔ نصاب میں مؤثر دینی تعلیم شامل کرنا ۲۔ دیگر علوم خصوصاً سوشل سائنسز کی اسلامی تناظر میں تدوین نو ۳۔ مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں ایسے مواد کا انتخاب جو تربیت میں ممد ہو ۴۔ مذکورہ دونوں اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسب ضرورت اضافی مواد کی تیار ۵۔ جہاں ممکن ہو وہاں پورے نصابی ڈھانچے پر نظر ثانی اور اس کی تدوین نو۔ ۶۔ مارکیٹ میں موجود نصابی کتب اور مواد میں سے اسلامی حوالے سے احسن ترین اور موزوں ترین کتب و مواد کی تلاش اور انتخاب۔

استاد

۱۔ ایسے اساتذہ کا حصول جو سکول کے وژن اور مشن سے متفق ہوں اور اس کے لئے جذباتی لگن رکھتے ہوں

۲۔ ایسے اساتذہ اگر مارکیٹ سے نہ ملیں تو فریش گریجوایٹس ہائر کر کے خود ان کی تربیت کرنا

۳۔ مذکورہ تربیت میں فنی اور پیشہ ورانہ پہلوؤں کے ساتھ اس امر پر ترکیز کہ خود اچھا مسلمان کیسے بننا ہے اور طلبہ کو کیسے بنانا ہے؟ اساتذہ کو بہت اچھی تنخواہ دینا

۴۔ ایسے پرنسپل کا انتخاب جو اس مقصد کے لئے ٹیم کی رہنمائی کر سکے اور ٹیم کو متحرک کر کے اہداف حاصل کر سکے۔

تعلیمی ادارے کا ماحول

ا۔ اس کے لئے ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں کی تنظیم۔ ان سرگرمیوں کی تفصیل اس ہینڈ بک میں دوسری جگہ موجود ہے بطور مثال:

۔ طلبہ کے درمیان تقریری وتحریری مقابلے اور ان میں ایسے موضوعات کا انتخاب جو اسلامی ہوں۔ ہر طالب علم کی فائل بنانا جس میں تربیتی حوالے سے اس کا ریکارڈ ہو۔طلبہ کی تربیت کے لئے لائحہ عمل تیار کرنے اور تربیتی مسائل کے حل کے لئے تربیت کمیٹی کا قیام اور اسے فعال، متحرک اور مؤثر بنانا۔ تربیت کے حوالے سے والدین سے رابطہ اور ان کی استعانت۔ کھیل اور تعمیری تفریح کے مواقع مہیا کرنا۔سکول میں اچھی لائبریری قائم کرنا اور اس سے استفادے کے عملی مواقع۔سکول اور ہوم ورک کے لئے ٹائم ٹیبل بنانا اور اس پر مؤثر عمل درآمد۔۔۔۔وغیر ذلک

پہلا لیکچر

احمد جاوید

مغربی تہذیب کا فکری پس منظر

ڈاکٹر امین صاحب نے جو موضوع تجویز فرمایا ہے اور اس کے کچھ حصوں پر گفتگو کرنے کی خدمت میرے سپرد کی ہے اس کے بارے میں کچھ تمہیدی باتیں عرض کر دوں اور ممکن ہے کہ ان تمہیدی باتوں میں ہی آج کا وقت تمام ہو جائے کیونکہ میرے ذہن میں ہے کہ یہ سلسلہ کوئی دس بیس نشستوں تک تو چلے گا اور میں ان میں کسی لیکچرر کی پوزیشن نہیں لینا چاہتا بلکہ ان نشستوں کو آپس میں نتیجہ خیز گفتگو کا ذریعہ بنانا چاہتا ہوں۔ میرے ذہن میں یہ نہیں ہے کہ میں یہاں کچھ سکھانے کے لیے حاضر ہوا ہوں، میرے ذہن میں اگر ہے تو صرف اتنا کہ ہم اپنے یقینی اسبابِ زوال کو پہچان کر انہیں دور کرنے کا وہ لائحہ عمل کیسے اختیار کریں کہ جس کے لیے ایک مضبوط شعور اور ایک بڑے کردار کی ضرورت ہوتی ہے۔

دنیا میں وہ تہذیبیں فنا ہو جاتی ہیں جو Logical Perfection تو رکھتی ہیں لیکن اپنے Ideals کو actualize نہیں کر پاتیں۔ ہمارے تنزل کی تمام قسموں کا سبب ایک تو یہ ہے کہ ہم اپنی اقدار کو روبہ عمل میں نہیں لا سکے اور اس سے بھی زیادہ سنگین بات یہ کہ وہ اقدار ہمارے حافظے میں بھی کسی مرکزی جگہ پر موجود نہیں ہیں یعنی ہماری تمام زندگی اور انسان کے بارے میں بنیادی قدریں جو

ہیں وہ شعور میں جگہ بنانے والی منطق بھی ہمارے لیے lose کر چکی ہیں اور طبیعت میں راسخ ہو جانے کے لیے جو رغبت درکار ہے وہ رغبت بھی ہماری وجہ سے کھو چکی ہے۔ یہ ہے وہ بڑا مسئلہ جس کا اول تو ہمیں تفصیل کے ساتھ شعور ہونا چاہیے اور دوسرے مرحلے پر اس کے تدارک کی نتیجہ خیز کوشش ہونی چاہیے۔

اس مقصود کو حاصل کرنے کا جدید دنیا میں سب سے بڑا راستہ یہ ہے کہ ہم مغرب کے بارے میں اپنے علم کو صحیح کریں، ہم مغرب کے بارے میں اپنے علم کو ضروری حد تک کامل بنائیں کیونکہ اس دنیا میں بگاڑ اور سدھار کے جتنے بھی راستے نکلیں گے وہ سب مغرب کے رد و قبول کے نتیجے میں نکلیں گے۔ اس بات سے عملاً انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ دنیا جو کچھ بھی بنے گی وہ مغرب کو رد یا قبول کرنے کے نتیجے میں بنے گی جیسے افلاطون کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فلسفے کی تمام پیش قدمی یا تو افلاطون سے اختلاف پر کھڑی ہے یا اس سے اتفاق کا نام ہے۔ تو مغرب نے انسان کی نفسیاتی دنیا اور اس کے آفاق میں ایک ایسا مرکزی تسلط بہر حال اختیار کر لیا ہے کہ اب انسان اور انسانی دنیا کے بارے میں ہمارا کوئی تصور اپنی تشکیل کے عمل سے گزر ہی نہیں سکتا تاوقتیکہ ہم مغرب کے تصور انسان اور تصور دنیا کو زیر بحث نہ لائیں۔ اب اگر دنیا کو آگے چل کر ہمارے ہاتھوں سے بگڑنا یا سنورنا ہے تو ہمیں پہلے ہی قدم پر موجودہ دنیا کو بنانے والی سب سے بڑی بلکہ واحد قوت کے بارے میں اپنے موقف کو قائم کرنا پڑے گا، درستی کے ساتھ، ذہانت کے ساتھ اور ایک بڑے نصب العین کی طرف یکسوئی کے ساتھ۔

تکرار کے خدشے کے باوجود میں اپنے اطمینان کے لیے کہ میں اپنی بات پوری طرح کہنے میں کامیاب ہوا ہوں میں اس چیز کو دہرانا چاہتا ہوں کہ تہذیبیں پیدا ہوتی ہیں اپنی نفسیاتی بنیاد میں۔ میں تہذیبوں کی metaphysicality پر بات نہیں کر رہا۔ انسانی تہذیب اپنی مکینیکل اور نفسیاتی سطح پر structural ہیئتوں میں دو تصورات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے: ایک یہ کہ اس کا تصور آدمی کیا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کا تصورِ دنیا کیا ہے؟ ہر تہذیب اپنے تصورِ آدمی اور اپنے تصورِ دنیا کو جس حد تک عمل میں لا کر نتیجہ خیز بنانے میں کامیاب ہوتی ہے اسی حد تک وہ اپنی بقا کے اسباب اور اپنے وجود کا جواز فراہم کرتی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے میں یہ عرض کر رہا تھا کہ موجودہ دنیا کا تصورِ آدمی ہو یا تصورِ عالم ہو یہ دونوں الف سے ی تک مغرب کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس وقت اگر کوئی تصورِ آدمی نتائج پیدا کرنے میں

عملاً کامیاب ہے تو وہ مغرب کا تصورِ آدمی ہے، اگر اس وقت کوئی تصورِ دنیا عمل میں آنے میں کامیاب ہوا ہے تو وہ مغرب کا تصورِ دنیا ہے اور اس میں جو کچھ بھی کمی رہ گئی ہے وہ کمی اس لیے نہیں ہے کہ اس تصور کے مخالف کچھ تصورات پنپ رہے ہیں اسے چیلنج کرنے کے لیے یا اسے remove کرنے کے لیے بلکہ وہ کمی اس لیے رہ گئی ہے کہ ان کی global audiance میں ان کی قبولیت کی استعداد کم ہے یعنی مغرب کے پھیلاؤ میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو اس کا سماجی سبب یہ ہے کہ پوری دنیا کے بعض طبقات اگر پوری طرح westernise نہیں ہو رہے یعنی مغربی تصورِ دنیا اور تصورِ آدمی کو اپنے اندر برسرِ عمل نہیں لا پا رہے تو اس کا سبب مغرب کے ورلڈ ویو کی ناکامی نہیں ہے بلکہ ان کی قبولیت کے مادے کی کمزوری ہے اس وقت دنیا یا تو westernise ہو چکی ہے اپنے بنیادی تصور کی سطح پر یا westernise ہونے کی امیدوار ہے۔ اس situation پر خوش بھی ہوا جا سکتا ہے اور اس صورتحال پر فکرمند بھی ہوا جا سکتا ہے۔ لیکن ہماری خوشی ہو یا ہماری فکرمندی ہو اس سے مغربی تہذیبی غلبے کے ثبوت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا اور جو ہماری موجودہ روش ہے وہ روش اس خطرے کی مزاحمت کرنے کے لیے ابتدائی درجے پر بھی کافی نہیں ہے۔ یہ ہم انشاء اللہ وقتاً فوقتاً مباحث کی مناسبت سے دیکھتے رہیں گے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کم از کم میری حد تک اس ساری گفتگو کا مقصد ایک ہے۔ وہ مقصد یہی ہے کہ ہم اپنے آپ کو فنا کی اس طغیانی سے بچائیں جس کی رفتار روز بروز تیز ہوتی جا رہی ہے اور اس معاملے میں تین رویے جو ہم نے مجموعی طور پر اختیار کر رکھے ہیں ان تین رویوں سے خود کو نکالیں اور میری گفتگو میں کچھ ایسے مراحل نظر آ سکتے ہیں کہ جو مایوسی پھیلانے والے لگیں لیکن آپ میں سے ہر شخص کو کم از کم میری اس بات پر اعتبار ہونا چاہیے کہ مغرب سے دشمنی کے تصور اور جذبے میں آپ حاضرین میں سے کوئی شخص یقیناً ایسا نہیں ہوگا جس سے مجھے کم سمجھا جائے۔ اس پس منظر میں آپ کو میرا مؤقف سمجھنے میں آسانی رہے گی۔ ہم نے جس سفاک ہاتھ سے غیروں کو پکڑنے کی مشق شروع کر رکھی ہے اصل میں ضرورت ہے کہ اس سفاک ہاتھ کو ہم اپنی گردن کی طرف بڑھائیں۔ ہم اپنی اصلاح کی طرف سفاکی دکھائے بغیر ان خطرات سے خود کو بچا نہیں سکتے جن میں سے محض چند کا ہمیں شعور اور اندازہ ہے۔ اس معاملے میں کسی غلط فہمی کا امکان ہو سکتا تھا لہٰذا اس کے پیشگی ازالے کے لیے میں نے یہ عرض کیا۔

دوسرے مغرب کی ارتقائی تاریخ، یہ phrase اچھی نہیں ہے لیکن ہم یہ ان کی زبان بول رہے ہیں کہ مغرب کی تاریخی اور تہذیبی پیش قدمی کی جو تفصیل ہے اس کا مطالعہ اور اس کو سمجھنا ہمارے لیے مفید ہوسکتا ہے۔ افادیت کی وہ جہت یہی ہے کہ اس وقت مغرب غالباً دنیا کی واحد قوت ہے جس نے اپنے کم و بیش تمام orders عمل میں لا کر دکھا دیئے ہیں اور جس نے اپنے ورلڈ ویو کو شعور کی اعلیٰ سطحوں پر پہنچا کر عمل کے تمام تر پھیلاؤ میں نافذ کر کے بھی دکھا دیا ہے۔ مطلب یہ کہ اُن کا کوئی ایسا نظریہ نہیں ہے جس کی تائید میں وہ اس نظریئے سے پیدا ہونے والے عملی نتائج پیش نہ کرسکیں۔

اس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ ideals کو actualize کرنے کے آداب وضوابط اور وسائل و اسباب کیا ہیں؟ یہ ہم سیکھ سکتے ہیں۔ اور دوسرے ہم یہ سیکھ سکتے ہیں کہ اپنے تہذیبی مقاصد کو عملی طور پر کچھ ناکامی کی صورتحال میں رہنے کے باوجود شعور کے ایک زندہ مرکز کی حیثیت دے کر محفوظ کیسے رکھا جا سکتا ہے کیونکہ تہذیبیں اپنی اقدار کو اگر عمل میں نہیں لاسکتیں تو ان کی طرف یکسو رہنے کے لیے اپنے شعور میں ان کی مرکزیت کا اہتمام ضرور کرتی ہیں۔ اگر ہمیں اپنا جائزہ لینا ہوتو ایک سوال کا ہمیں بہت غیر جانب داری اور selflessly سامنا کرنا چاہیے کہ ہم اپنی مسلمہ اقدار کو آدمی اور دنیا کی سطح پر عمل میں لانے میں کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں؟ اس سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کیا ہم ان اقدار کو واقعتاً عمل میں لانا بھی چاہتے ہیں یا نہیں؟ ان دو سوالوں کا پوری دیانت اور پورے selfless ماحول میں ہمیں سامنا جلد یا بدیر کرنا ہوگا تو بہتر ہے کہ ہم اس موضوع سے فائدہ اٹھا کر اپنی بہتری یا بقا کا یہ سامان بھی کرتے چلے جائیں۔

اب پہلے کچھ درسی باتیں کر لیتے ہیں اس کے بعد ہم اس طرف آئیں گے جو میرے ذمے آج کے لیے کیا گیا ہے کہ میں مغرب کے یونانی origin پر کچھ تعارفی باتیں کروں۔

انسان کی قدیم تاریخ میں کم از کم تین روایتیں ایسی ہیں جنہوں نے بڑی بڑی تہذیبوں کو آگے چل کر جنم دیا۔ ایک ہندو روایت، ایک چینی روایت اور ایک یونانی روایت۔ یہ کلاسیکل ادوار کی تین بڑی روایتیں ہیں جنہوں نے آدمی کے grand perspective کو تشکیل دیا اور دنیا کی تہذیبی ساخت کا مسالہ فراہم کیا یعنی انسان کی نفسیاتی دنیا کی تعمیر کے اسباب فراہم کیے اور انسانی دنیا میں اس کی تہذیبی structuring کی۔ ان تین تہذیبوں میں سے ہندو تہذیب اپنے مزاج میں metaphysical ہے۔ ہندو metaphysics کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ میں یہ تمہید اس لیے باندھ رہا

ہوں کہ یونانی روایت کے ایک امتیاز کا پتا چل جائے جو مغربِ جدید کو سمجھنے میں ہماری کچھ مدد کرے گا۔

ہندو روایت transcendent کی روایت ہے۔ ہندو روایت کو transcendent کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت اپنی substantial form میں اور اپنے assense میں اس کائنات سے لاتعلقی کی حد تک ماوراء ہے۔ اس جملے کو اگر آپ سمجھنا چاہیں تو دو مظاہر سے سمجھ سکتے ہیں۔ ہندو میٹافزکس pure transcendent کی میٹافزکس ہے۔ pure transcendent کا مطلب یہ ہے کہ حقیقتِ واحدہ اس کائنات سے لاتعلقی کی حد تک بلند ہے اور اس کی ساخت وجودی نہیں شعوری ہے۔ اسی وجہ سے اُپنشد کا خلاصہ یہ ہے کہ حق ذات نہیں شعور ہے۔ اس کو سمجھنے کے اگر تیکنیکی اسباب یا فلسفیانہ استعداد میسر نہ ہو تو دو واقعات سے ہندو تہذیب کی دو مستقل خصوصیات کو سمجھا جا سکتا ہے کہ pure transcendence ہوتی کیا ہے۔

ہندو تہذیب میں دو چیزیں نہیں ہیں: ایک تاریخ اور دوسرے tragedy۔ ہندو تہذیب تاریخ کو آفاق سے خارج کرتی ہے اور tragedy کو انفس سے منہا کرتی ہے کیونکہ tragedy ہو یا history یہ دو جڑواں بچے ہیں دنیا کے اور آدمی کے تعلق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے۔ یعنی آدمی اور دنیا کا تعلق دو نتائج ضرور پیدا کرے گا: ایک تاریخ اور دوسرے tragedy۔ یعنی تاریخ آفاق کا mechanism ہے اور tragedy انفس کی روح ہے تو ہندو تہذیب ان دونوں سے اپنے آپ کو define نہیں کرتی۔ ان کے ہاں نہ تاریخ ہے نہ المیہ۔ ہندو تہذیب کے بارے میں یہاں اتنا ہی کافی ہے۔

چینی تہذیب ایک میٹافزیکل causation کا نام ہے۔ چینی تہذیب نام ہے اس بات کا کہ حقیقت اپنے شعور کی رو سے ماوراء ہے، اپنے وجود کی رو سے productive ہے یعنی حقیقت کا موجود ہونا کائنات سے ظاہر ہے، حقیقت کا معلوم ہونا کائنات سے میسر نہیں اس کو co-principle کہتے ہیں۔

ان دو قدیم تر روایتوں کے ہوتے ہوئے یونانی روایت کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے ایک فلسفیانہ مابعد الطبیعیات (philosophical metaphysics) کو جنم دیا۔ یہ جو دو روایتیں ہیں یہ مذہبی روایتیں ہیں، اعتقادی روایتیں ہیں، یونانی روایت نے metaphysical themes کو فلسفے کا موضوع بنایا اور انہوں نے میٹافزیکل مباحث کو تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک کلنیکل رنگ دینے کی کوشش کی۔

جس یونانی روایت کے بارے میں ہم بتا رہے ہیں کہ یہ مابعد الطبیعیات کی دو بڑی روایتوں

کے بالمقابل یہ امتیاز رکھتی ہے کہ اس نے میٹافزکس کو تقریباً empericise اور logicise کرنے کی کوشش کی۔ مطلب یہ ہے کہ اس نے میٹافزکس کو محسوساتی استدلال دینے کی کوشش کی اور ریاضیاتی Argument دینے کی سعی کی۔ انہوں نے میٹافزکس کو ایک logic فراہم کی اور میٹافزکس کو ایک scientific argumentation کے tool عطا کیے۔ یہ ہے یونانی روایت کا اصل امتیاز۔

تمام میٹافزکس دو پولز کے درمیان شعور کے مستقل فیصلے کا نام ہے۔ دو پولز کیا ہیں، روایتی میٹافزکس کے دو پول کیا تھے؟ حقیقت اور اعتبار (reality and Illusion)۔ یہ مابعد الطبیعی شعور کا بنیادی مادہ ہے۔ حقیقت اور اعتبار مابعد الطبیعی شعور کے تقدیری مسلمات ہیں۔ وہ چین میں ہوں، چاہے ہندوؤں میں ہوں اور بعد میں چاہے نیو پلاٹونزم میں ہوں۔ یونانیوں نے آ کر مابعد الطبیعی ذہن کے اس اسٹرکچر کو بدلا اور انہوں نے حقیقت اور اثر کو دو پولز بنایا۔ انہوں نے reality اور illusion کے تقدیری پولز کو بدل کر reality اور effects کے پول تعمیر کیے اور ان سے نتیجہ خیز علوم پیدا کر کے دکھائے۔ یونانیوں کے اس بنیادی کارنامے کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی ذہن کی استعداد سے پیدا ہونے والے تقریباً تمام علوم یونانی م آخذ سے پیدا ہوئے ہیں یعنی تاریخ انسانی میں انسانی شعور نے جتنے علوم ایجاد کیے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام Greek Episteme پر ایجاد ہوئے ہیں۔

Greek Episteme (یا یونانی فلسفۂ علم کے منہاج) سے علوم ایجاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شعور کا ایک بنیادی اندازِ ادراک یا ایک خلقی اسلوبِ ادراک ہوتا ہے، وہ اسلوبِ ادراک ہی تمام علوم کی ماں ہوتا ہے، وہ اسلوبِ ادراک ایک grand تصور کے تابع ہوتا ہے۔ اسلوبِ ادراک پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر انسانی ذہن جتنے بھی علوم ایجاد کرتا ہے ان علوم میں معانی پیدا کرنے کا پورا نظام اس grand تصور سے حاصل ہوتا ہے۔ ان علوم کے مقاصد کا پورا شعور اس ذہنیت سے حاصل ہوتا ہے جو اس grand تصور نے پیدا کیے ہیں۔

یونانیوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شعور کی مستقل ماہیت اور شعور کی مستقل ضرورت کو اتنے کمال، شدت اور جامعیت کے ساتھ متعین کر دیا کہ شعور میں جاننے کا مزاج اور شعور میں جاننے کی urge اور شعور میں جاننے کے مقاصد وہ سارے کے سارے Greek episteme کے تابع ہو گئے۔ یہ اثر یعنی انسانی شعور اور اس کی کارکردگی پر ایسا تقدیری اثر کسی اور کلاسیکل روایت کا نہیں ہے۔ یعنی انسانوں نے اپنے آپ کو جاننے کے لیے کچھ علوم ایجاد کیے، انسان نے

اس دنیا کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے کچھ علوم ایجاد کیے اور انسانوں نے اس دنیا کی حقیقت کو دریافت کرنے کے لیے کچھ علوم پیدا کیے۔ ان تینوں دائروں میں جتنے بھی علوم پیدا ہوئے ہیں ان کا basic episteme اور ان کی basic logic یونانی ہے۔ یہ ہے یونانی روایت کا وہ امتیاز جس نے مغرب کو پیدا کیا اور اسلام میں مذہبی شعور کی چند بڑی روایتوں کو جنم دیا۔ یعنی یونانی روایت کی اثر اندازی کا یہ عالم ہے کہ یہ مذہب اور تہذیبوں کے امتیازات کو پھلانگ کر ایک شانِ عالمگیری کے ساتھ انسانی ذہن پر اثر انداز ہوا ہے۔ باقی تمام روایتیں یونانی روایت کے مقابلے میں فلسفے کی دنیا کے اندر مقامی نوعیت کی (local) ہیں، فلسفے کی دنیا میں اگر کوئی روایت بین الاقوامی نوعیت کی ہے تو وہ یونانی روایت ہے۔

آپ ذرا غور کیجیے کہ تمام فزیکل علوم، تمام سوشل علوم، تمام سائیکولوجی، تمام انٹالوجی، تمام بنیادی تصورات کو تخلیق کرنے والے علمی اصول ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی جڑیں یونانی روایت میں واضح طور پر نہ ملتی ہوں اور پھر آپ دیکھیے کہ عیسائیوں کو فلسفے کے بالمقابل اپنے مذہب کے دفاع کی ضرورت پڑی تو اس کی دستگیری یونان نے کی، مسلمان متکلمین کو اپنے دفاع کے لیے یا فلسفیوں کو اپنے اظہار کے لیے کسی روایت کی حاجت ہوئی تو وہاں یونانی آ گئے حتیٰ کہ ہندوؤں میں بھی یونان کی اثر اندازی موجود ہے۔ پھر اس روایت نے اپنے آواگون کا پورا نظام وضع کر رکھا ہے۔ ایک جگہ یہ افسردہ اور پژمردہ ہوتی ہے تو دوسری جگہ اپنی نئی زندگی کا سامان کر لیتی ہے۔ کوئی روایت ایسی نہیں ہوئی جس سے جنم لینے والے بچے بھی mother tradition بنے ہوں سوائے یونانی روایت کے۔ یہ وہ روایت ہے مغرب جس کا وارث ہونے کا دعویدار ہے۔ ہم بھی اس سے متاثر ہوئے لیکن ہم نے اس کا وارث بننا، بہت درست بنیاد پر، بہت ہی بڑی تہذیبی بصیرت کی روشنی میں، قبول نہ کیا۔ یہ ہماری دینی، تہذیبی اور نفسیاتی بصیرت تھی کہ اس نے مسلمانوں کی Hellenization کے عمل کو روک دیا لیکن مغرب تو اس کا مدعی ہے کہ Renaissance سارے کا سارا Hellenization کا عمل تھا۔

یونانی روایت کے چار بڑے موضوعات ہیں جن کی حیثیت ان کے تمام علوم کی بنیادوں کی ہے۔ ایک ان کی Ontology ہے، ان کی Cosmology ہے۔ انٹالوجی کا مطلب ہے وہ علم جو یہ جواب دے کہ وجود کیا ہے؟ وجود کا origin کیا ہے؟ کاسمولوجی یہ ہے کہ کائنات اپنا Prime

Matter کون سا رکھتی ہے؟ کائنات کے Prime Matter کی تحقیق کا علم کاسمولوجی کہلاتا ہے۔ ان کا تیسرا شعبہ سائیکالوجی ہے کہ انسان کیا ہے؟ جو علم اس کا جواب دے وہ علم سائیکالوجی ہے۔ چوتھی ان کی روایت ہے Orphism کی، وہ الگ ہے۔

یہ تین انتہائی اہم Disciplines of Knowledge ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ اہل یونان نے پیدا نہیں کیے لیکن یونانیوں نے ان تین علوم کی جو definition کر دی اس definition میں آج تک ادنیٰ درجے کی تبدیلی نہیں آ سکی۔ یہ تو ہوئی ایک بات دوسری یہ کہ یہ یونانی تھے جنہوں نے آ کر بتایا کہ انسان کے دو سب سے بڑے مسائل ہیں یعنی انسان کی دو سب سے بڑی ضرورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس پر واضح رہنا چاہیے کہ خدا کیا ہے؟، کائنات کیا ہے؟ انسان کیا ہے؟ اور اس 'کیا ہے' کا جواب ایک سطح پر تین ہونے چاہئیں اور اس سے بلند سطح پر ان تینوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہونا چاہیے۔

دوسرا مسئلہ جو فیثاغورث نے اٹھایا— اور فیثاغورث ایسا آدمی ہے کہ جس کا نام ذہن میں آ جائے تو شعور کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ یہ اتنے بڑے لوگ ہیں۔ فیثاغورث یقیناً ایسا آدمی ہے، گو ابھی اس کے بارے میں معلومات کم ہیں— تو ہم نے یونانی فلسفے کی تفصیل گو یا سقراط اور افلاطون سے شروع کی ہے، اس سے پہلے کی زیادہ تفصیلات ہمارے پاس نہیں ہیں لیکن فیثاغورث ایک ایسا آدمی ہے جس نے ان تین سوالوں کے تین جوابات اور ایک جواب دونوں دے کر دکھایا۔ اس پر ان شاء اللہ پھر کبھی گفتگو ہوگی۔

یہ دوسرا مسئلہ ذرا سا ٹیڑھا ہے، اور اتنا مشکل ہے کہ اسے منہ سے نکالتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔ وہ مسئلہ ہے شعور اور وجود کی identity کا۔ فیثاغورث کہتا ہے کہ انسانی وجود کو کمال کی اور انسانی شعور کو realization کی ضرورت ہے۔ انسان کی دو سب سے بڑی ضرورتیں ہیں: perfection اور realization۔ پرفیکشن وجود کی ضرورت ہے اور ریلائزیشن شعور کی حاجت ہے۔ یہ جو شعور اور وجود ہیں اگر یہ ایک نہ ہو پائیں تو نہ پرفیکشن میسر آئے گی نہ ریلائزیشن حاصل ہو گی۔ 'حقیقت' فیثاغورث کے الفاظ میں نام ہے شعور اور وجود کے ایک ہو جانے کا۔ اب شعور اور وجود کے ایک ہو جانے کے مبحث کو اٹھا کر اس نے انسان کے وجودی مطالبات اور انسان کی علمی ضروریات میں کتنی بڑی بڑی رفعتوں کے دروازے کھولے ہیں، یہ ہم ان شاء اللہ آئندہ عرض کریں گے۔

سوال و جواب

سوال: ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں امام رازی۔ بہت بڑے عالم تھے ان کی تفسیر کبیر کئی جلدوں میں ہے اور ان کے بارے میں علماء کرام کا ایک تاثر یہ ہے کہ جس قوت سے انہوں نے فرق ہائے ضالہ کے اعتراضات اٹھائے ہیں اتنی قوت سے ان کا رد نہیں کر پائے۔ آپ نے اہل یونان اور ان کی فکر کی جس طرح توصیف و تعریف کی ہے، خدانخواستہ کہیں امام رازی والا معاملہ نہ ہو جائے — کیونکہ ہمارا تو مرض ہی مغربی فکر و تہذیب سے مرعوبیت ہے اور اسی کا علاج تو مطلوب ہے جس کے لیے ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

جواب: بھائی! یہ نہایت ہی نرم تنقیدی ردعمل آیا ہے۔ اسی کی پیش بینی کر کے کہہ رہا تھا کہ مغرب پر لعنت بھیجنے کے لیے بھی لعنت بھیجنے والے کو کسی رائے کا حامل ہونا چاہیے۔ رستم کو کمزور سمجھ کر گرانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ ہم یونانی روایت کی بات کر رہے ہیں وہ ہماری بھی محسن روایت ہے۔ یہ یونانی روایت کی مداحی ہو رہی تھی، مَیں مغرب جدید کی تعریفیں نہیں کر رہا تھا۔ اور جو شخص افلاطون کی تعظیم کا تصور نہیں رکھتا وہ قرآن بھی نہیں سمجھ سکتا، اس کو علم سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ اس کے اندر انسان ہونے کی qualification ہی نہیں ہے جو سقراط، افلاطون اور فیثاغورث سے متاثر نہیں ہوسکتا اور ان کے لیے تعظیمی جذبات نہیں رکھتا۔ ہمارے ذہنوں کا عامیانہ پن ہمارے دشمنوں کی گہری پلاننگ کا جواب نہیں ہوسکتا۔ ہم تمام مسائل کو چند جارحانہ جذبات اور چند عامیانہ خیالات سے face کرنا چاہتے ہیں، یہی ہمارے زوال کا سب سے بڑا سبب ہے کہ جس قوت سے لڑنے کے لیے غزالی جیسا آدمی چاہیے ہم اس قوت سے لڑنے کے لیے امام جمعہ پر تکیہ اور انحصار کر رہے ہیں۔ آپ لوگ اس کو سمجھیں اور ابھی بہت سے خطرات ہمارے لیے پیدا کرنے کا مغرب مصمم ادارہ کر چکا ہے جن کا فی الحال ہمارے یہاں شعور بھی نہیں پایا جاتا۔

میری اس طرح کی مصروفیات کا واحد مقصد یہ ہے کہ آپ کی خدمت میں عرض کروں کہ ہم مغرب کے دجل سے جو اسلام کو اب تک پیش آنے والا سب سے بڑا چیلنج ہے، عہدہ برآ کیسے ہوں اور اپنی survival کا درست رخ کے ساتھ اہتمام کیسے کریں؟۔ اور اس زوال اور بے بسی میں جس قدر ذمہ داری ہماری ہے ہم اسے بھلا کر سارا الزام مغرب کو دینے کی ایک عادت بنا چکے ہیں، یہ

عادت نہ صرف ہمارے لیے مضر ہے بلکہ یہ عادت بعض مرتبہ مغرب کے جال میں پھنسنے کا سبب بنتی ہے۔ ابھی تو وہ آ کے سکھائے گا کہ قرآن کیسے پڑھتے ہیں اور اسلام کیسا ہونا چاہیے؟ اور آپ ہی میں سے کچھ لوگ اٹھ کر کہیں گے کہ جی ہاں، جی ہاں، اسلام ایسا ہی ہونا چاہیے۔

اس سے نکلنے کا پہلا راستہ یہ ہے کہ آپ کو یہ معلوم ہو کہ مغرب ہے کیا اور وہ آپ کو کتنا نقصان پہنچا چکا ہے، کتنا نقصان پہنچانا چاہتا ہے اور کتنا نقصان پہنچا سکتا ہے؟ آپ نے دیکھا کہ نائن الیون کے بعد سے کم از کم سو بہت ہی زیادہ پڑھی جانے والی کتابیں اسلام کے خلاف چھپ چکی ہیں۔ وہ سو کتابیں جو بہت ہی high سکالرشپ کے ساتھ لکھی گئی ہیں، ان سو کتابوں میں سے دس برس میں کسی ایک کا جواب پورے عالم اسلام میں سے کسی نے نہیں دیا۔ یہ ہمارے کرتوت ہیں۔

دوسرے یہ کہ چلو ہمارے ذہن کچھ پیچھے رہ گئے لیکن ہم کردار میں ان سے آگے نکل گئے ہوتے۔ ذہن اور کردار یہ نیکی کی دیگر شخصی اقسام سے بڑھ کر دینی ضرورتیں ہیں۔ یہ ہمارے دین کی ضرورت ہے کہ ہمارا ذہن اپنے زمانے کے معیارِ ذہانت پر حاکم ہو اور ہمارا کردار اپنے زمانے میں prevail کرنے والی سطحِ اخلاق پر حاوی ہو۔ کیا ہم ہیں؟

سوال: آپ نے بڑی وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ یونانی روایت کی ایک بڑی خوبی حقیقت پر ان کا اعتبار ہے ان کے دیگر تصورات کے بارے میں بھی آپ نے گفتگو کی ہے لیکن آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ ان کا تصورِ حقیقت ہے کیا؟

جواب: بہت عمدہ! دیکھیں سوال ایسا ہونا چاہیے۔ گفتگو میں یہ ایک بڑی کمی رہ گئی تھی جس کا اگلی گفتگو میں پورا ہونے کا امکان بھی نہیں تھا۔ یہ بات کرنے کا موقع ابھی ہے۔

جس طرح ہندوؤں کے ہاں حقیقت ایک Transcendent Principle ہے، ایک Conscious Principle ہے، Being Principle نہیں ہے۔ جس طرح چینیوں کے ہاں حقیقت ایک Being Principle ہے لیکن وجودی طور پر Transcendent نہیں ہے۔ یونانیوں کے ہاں حقیقت ایک order کی طرح ہے، ان کے یہاں حقیقت کی بناوٹ Cosmic ہے۔ حقیقت کے بارے میں یونانیوں کی بنیادی اپروچ یہ ہے کہ حقیقت میرے تصور سے ثابت نہیں ہو گی بلکہ کائنات کے order سے برآمد یا reflect ہو گی۔ یونانیوں نے پہلی مرتبہ حقیقت کو

☆ سابق ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ایک cosmic order کے طور پر تصور کرنے اور ایک ریاضیاتی منطق کے نتیجے میں ثابت کرنے کی روایت پیدا کی۔ ان کی دوسری روایت ہے symbolism کی لیکن یہ فیثاغورث کے بعد چلی نہیں جس پر ہائیڈیگر نے کہا کہ اصل فلسفہ تو pre-Socratic ہے۔ symbolism کی روایت یہ ہے کہ حقیقت ایک symbolized origin ہے لیکن یہ روایت چونکہ چل نہیں پائی لہٰذا ہمارے پاس کافی data موجود نہیں ہے کہ ہم اس پر تفصیل سے گفتگو کرسکیں لیکن Reality ایک Cosmic Order ہے، ایک Changeless Cosmic Order، یہ تصور یونانیوں کا دیا ہوا ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی

وسطیہ

اسلام کا فلسفۂ اعتدال

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر چیز کو کسی نہ کسی مقصد اور حکمت کے تحت پیدا کیا۔ کائنات کی تمام مخلوقات میں سب سے نمایاں مقام انسان کو حاصل ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عقل وفکر اور علم کی صلاحیتوں سے نوازا ہے، ساتھ ہی یہ دنیا اس کے لیے دارالامتحان بھی ہے۔ اس لیے کہ انسان اس دنیا میں خیر وشر دونوں صلاحیتوں کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَ نَفۡسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَ تَقۡوٰىهَا“ (الشمس ۹۱:۷۔۸)

”اور قسم ہے انسانی جان کی اور اس ذات کی جس نے اسے درست اور معتدل اعضاء کے ساتھ بنایا، اور پھر خیر و شر دونوں کی سمجھ اور صلاحیت القاء کی ۔“

۱۔ و کل مولود فی العالم علی ذالک الاقرار و ہو الحنیفہ التی وقعت الخلقۃ علیھا و ان عبد غیرہ، کما قال تعالیٰ و لئن سألتھم من خلقھم لیقولن اللہ، و قالوا: و ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی۔ البغوی معالم التنزیل ۳ ص ۴۸۳۔

ہر انسان نیکی اور بدی دونوں صلاحیتوں کے ساتھ دنیا میں آتا ہے، لیکن طفولیت کے آغاز میں نیکی کا شعور غالب ہوتا ہے، اس لیے کہ ہر بچہ کی پیدائش دین فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے موقعہ پر جو نفخ روح کا عمل ہوا تھا اس نے انسان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف کو اپنے اندر اجاگر کر سکے، نفخ روح نے ہی ایک طرف علم وفکر کی بلندیوں کو چھونے کی صلاحیت پیدا کی تو دوسری طرف روحانی و اخلاقی بلندیوں کے حصول کی صلاحیت بھی پیدا کر دی۔ اب اگر انسان کو سازگار اور تعمیری ماحول میسر ہو، تعلیم و تربیت کا بہتر انتظام ہو تو وہ انسانیت کے اعلیٰ مقام کو حاصل کر سکتا ہے، اور اپنے علم وفکر، اخلاقِ فاضلہ اور کردار سے معاشرہ اور گردوپیش کے ماحول پر بہت عمدہ، صحت منداور تعمیری اثرات مرتب کر سکتا ہے۔

سورۂ روم میں وارد آیت فطرت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی اصل خیر پر مبنی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس دین فطرت پر پیدا فرمایا جو سراسر خیر ہے:

"فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ" (الروم: ۳۰:۳۰)

"پس (اے محمدؐ) یکسو ہو کر اپنا رخ دین حنیف (اسلام) کی طرف کر لیجیے، اللہ تعالیٰ کی اس فطرت پر ثابت قدم رہیے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیے، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔"

اس آیت مبارکہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ پیدائشی طور پر ہر انسان دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اسے حق و باطل کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اگر انسان اسی فطرت سلیمہ پر قائم رہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے تو وہ ہمیشہ حق وصداقت کی طرف مائل رہے گا۔ اس بات کی وضاحت احادیث میں بھی ملتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے:

"کل مولود یولد علی الفطرة فابواہ یھودانه و ینصّرانه کما تناتج الابل من بھیمة جمعا، ھل تحس من جدعاء" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۴۷۱۴، صحیح بخاری، کتاب الجنائز حدیث نمبر ۱۲۹۶؛ صحیح مسلم، کتاب القدر، حدیث نمبر ۴۸:۳)

"ہر بچہ جو بطن مادر سے پیدا ہوتا ہے وہ اصل فطرت پر پیدا ہوتا ہے، بعد میں اس کے والدین اسے

یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں، (اس کی مثال ایسے ہے جیسے) جانور کے پیٹ سے مکمل صحیح وسالم بچہ پیدا ہوتا ہے، کوئی بچہ بھی کٹے ہوئے کان لے کر نہیں آتا۔''

حجاج بن منہال ''فطرۃ'' کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے اس عہد کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے ارواح آدم سے لیا تھا۔ **الست بربکم** کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تمام ارواح نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف کیا۔ (دیکھیے ابوداؤد، سنن، حدیث نمبر ۴۷۱۶) گویا ہر فرد عہد الست والی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ (۱) ان آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل فطرت تو اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی ربوبیت اور اس کے معبود ہونے کے اعتراف پر مبنی ہے، لیکن ولادت کے بعد انسانوں کا پیدا کردہ ماحول اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے کہ ماحول کا اثر نہ صرف انسان کے ظاہر پر ہوتا بلکہ فکر اور کردار پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ صحتمند جسمانی اور فکری ارتقاء کے لیے ہر فرد کو ایک بہتر صحت مند اور صالح ماحول کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس ماحول میں اس کی ذہنی، فکری، ظاہری اور باطنی صلاحیتیں بہتر طور پر پروان چڑھ سکیں۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا محور بھی یہی رہا ہے کہ وہ تعلیم و تربیت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعہ انسانی معاشرہ کے لیے ایسا مضبوط اور موثر ماحول پیدا کرتے ہیں جس میں شر کی قوتیں توسمٹ کر رہ جاتی ہیں اور خیر کی تمام قوتوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام انسانوں کی فطرت کی حفاظت اور ان میں اعتدال کو برقرار رکھنے کے لیے ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ خیر کی صلاحیتیں پھلیں پھولیں اور اس قدر توانا ہو جائیں کہ شر کی صلاحیت ان کے سامنے ماند پڑ جائے اور غیر موثر ہو جائے۔

اس قسم کے ماحول کی تشکیل کے لیے انبیاء علیہم السلام اپنے کام کا آغاز انسانوں کی فکری تطہیر اور اخلاقی تربیت سے کرتے ہیں۔ جہاں تک فکری تطہیر کا تعلق ہے تو انبیاء انسانیت کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں، ایمان، اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین انبیاء علیہم السلام، جو وحی الہی کی عملی تشکیل کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں، کی مکمل اطاعت اور آخرت میں اپنے تمام اعمال کے حساب و کتاب اور اعمال کی بنیاد پر آخرت میں جزا وسزا کے عقیدہ سے کرتے ہیں۔

عقیدہ توحید، اس کی وسعت و ہمہ گیری کا شعور، عقیدہ رسالت اور رسالت مآب سے ہمارے تعلق کا ادراک، اس کائنات کی حقیقت اور اس کائنات میں انسانی منصب و مقام کا فہم اور اسی اعتبار سے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا شعور انسانی فکر کو نہ صرف مستحکم کرتا ہے بلکہ کمال کی جانب ارتقائی مراحل طے کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔

دوسرا اہم کام انسانی رویوں کی تعمیر وتہذیب کا ہے، انبیاء علیہم السلام دو پہلوؤں سے یہ فریضہ انجام دیتے ہیں، سب سے پہلے وہ انسانوں کے قلوب کے تزکیہ اور باطن کی تطہیر کا کام کرتے ہیں۔ تزکیہ نفس انبیاء علیہم السلام کے فرائض منصبی میں تلاوت وحی کے بعد سب سے مقدم کام ہے۔ تطہیر باطن کے لیے ضروری ہے کہ نفس انسانی میں اگر حرص وطمع، کذب و نفاق، حسد وتعصب، نفرت و عداوت، خیانت و بدگمانی، خود پرستی وشہوت پرستی کی آلودگیاں پائی جاتی ہوں تو جب تک باطن کو ان امراض اور آلودگیوں سے پاک صاف نہیں کیا جاتا اس وقت تک قلوب میں فضائل کو پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ انبیاء علیہم السلام ان تمام رذائل کو کھرچ کھرچ کر صاف کرتے ہیں اور پھر تعمیر انسانیت اور شخصیت سازی کا عمل اخلاص ویقین، صدق و امانت، صبر وتقوی، رحم دلی اور جذبہ عفو درگزر کی تعلیم و تربیت سے کرتے ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں ایمان اور اخلاق لازم وملزوم ہیں۔ لہذا انبیاء کے مشن میں ایمان اور اخلاق کی تعلیم یکساں اور ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ایمان کا تعلق قلب سے ہے، اس کا اصل اظہار اعلی اخلاقی اقدار میں ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل احادیث ایمان اور اخلاق کے تعلق کو خوب واضح کرتی ہیں:

"لا ایمان لمن لا امانة له ولا دين لمن لا عهد له" (مسند احمد بن حنبل حديث نمبر ۲۱۰، ۱۵۴، ۱۲۵)

''جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان بھی نہیں اور جو عہد کی پاسداری نہیں کرتا اس کا کوئی دین و ایمان نہیں۔''

"والذی نفسی بيده لا يؤمن عبد حتى يحب لجاره ما يحب لنفسه" (مسلم حديث نمبر ۷۲، ۱۷۱؛صحيح بخاری، كتاب الايمان حديث نمبر ۷)

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری زندگی ہے، کوئی بندہ مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے پڑوسی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔''

"ليس المؤمن الذی يشبع و جاره جائع الی جنبه" (بخاری ، الادب المفرد حديث نمبر ۱۱۲؛بيهقی، السنن الكبری ج ۱۰ ص ۳۰)

''وہ شخص مومن نہیں جو خود شکم سیر ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔''

لا یؤ من الذی لا یأمن جارہ بو ائقہ (کنز العمال حدیث نمبر ۱۹۴۲)

''وہ شخص مومن نہیں ہوسکتا جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ رہے۔''

امام بخاری نے اس حدیث کو اس طرح نقل کیا ہے:

''من کان یومن باللہ فلیکرم جارہ'' (صحیح بخاری، کتاب الادب حدیث نمبر ۳۱؛ مسلم کتاب لایمان حدیث نمبر ۷۶)

''جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کا احترام کرے۔''

زبیری نے اسی مفہوم کی حدیث کو اس طرح نقل کیا ہے:

''لا یؤ من باللہ من لم یکرم جارہ'' (اتحاف السادۃ المتقین للزبیری ج ۷، ص ۳۵۸ (بیروت، ت ن)

''وہ شخص تو مؤمن نہیں ہوسکتا جو اپنے پڑوسی کی عزت نہ کرتا ہو۔''

''لایؤمن باللہ والیوم الآخر من اذا حدث کذب'' (السیوطی، الدرالمنثور ج۴، ص ۱۳۱، دارلفکر، بیروت، ت ن)

''وہ شخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والا نہیں ہوسکتا جو بولتا ہے تو جھوٹ ہی بولتا ہے۔''

''لایؤمن العبد حتی یحب لأخیہ مایحب لنفسہ یا لایؤمن احدکم حتی یحب لأخیہ مایحب لنفسہ'' (بخاری، صحیح بخاری، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۷: صحیح مسلم، صحیح مسلم، کتاب الایمان حدیث نمبر ۷۱)

''کوئی بندہ خدا بندہ مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

''لا ایمان لمن لا حیاء لہ'' (المنذری، الترغیب والترھیب ج۳، ص ۴۰۰ (مطبوعہ مصطفی الحلبی، قاھرہ، ت ن)

''اس شخص کا ایمان معتبر نہیں جس میں شرم و حیا نہیں۔''

ابن جریر الطبریؒ نے حضرت عبداللہ بن جواد کی ایک روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مجلس میں حضرت ابو الدرداءؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا کوئی مؤمن چوری کا ارتکاب کرسکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں کبھی مؤمن سے ایسی غلطی سرزد ہوسکتی ہے۔ انہوں نے پھر سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا کوئی مؤمن زنا کرسکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں کیوں نہیں، چاہے ابو الدرداء کو کتنا ہی برا کیوں نہ لگے، انہوں نے مزید سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا کوئی مؤمن جھوٹ بھی بول سکتا ہے آپؐ نے فرمایا کہ جھوٹ تو وہی بول سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ پھر فرمایا کہ بندہ سے لغزش ہو جاتی ہے لیکن پھر وہ اپنے گناہ پر احساس ندامت کے ساتھ

اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے، توبہ کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرما لیتے ہیں۔ (تھذیب الآثار ج ۳، ص ۱۳۵، حدیث نمبر ۲۲۳)

یہاں ہم مذکورہ بالا چند احادیث پر اکتفاء کرتے ہیں، یہ احادیث اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ایمان وہی معتبر ہے جو اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کے ساتھ مزین ہو، اس بات کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ایک خاتون کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ وہ بہت عبادت گذار ہے، صدقہ بھی خوب کرتی ہے، لیکن اپنی زبان پر اسے کنٹرول نہیں، اس کے پڑوسی اس کی بدزبانی سے تنگ ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ یہ خاتون جہنمی ہے۔ ایک دوسری خاتون کا تذکرہ ہوا کہ وہ عبادات وصدقات میں تو کمزور ہے لیکن پڑوسیوں کی راحت وآرام کا خیال رکھتی ہے، ان کے ساتھ حسن کلام سے پیش آتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ عورت جنتی ہے۔ (مسند امام احمد ابن حنبل ج: ۲ ص ۴۴۰، حدیث نمبر ۹۶۷۳)

انسان کی زندگی میں صحیح توازن اور اعتدال پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے انسانی فکر کا قبلہ متعین کر دیا جائے اور انسانی رویوں کو اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ انبیاء علیہم السلام اس منہج تربیت کے مطابق افراد کی ذہنی وفکری اصلاح اور ان کے ظاہری و باطنی اخلاق کی اصلاح کر کے انسانی معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔ اگر افراد اچھے ہوں گے تو ہمارے ادارے، تنظیمیں اور معاشرے بھی اچھے ہوں گے۔ لیکن اگر افراد کی اس نہج پر تربیت کا اہتمام نہ کیا جائے تو ان میں فکری بے راہ روی اور اخلاقی دیوالیہ پن کے جراثیم پرورش پائیں گے۔ چنانچہ وہ افراد جن کے افکار منفی و پراگندہ ہوں اور جن کے رویوں میں ایسے افراد جو فکری بے راہ روی کا شکار ہوں اور ان کے رویوں میں فساد وشر کے جراثیم بھرے ہوئے ہوں وہ اپنے ہی جیسے افراد کو منظم کر کے جو تنظیمیں بنائیں گے، یا ایسے افراد پر مشتمل جو ادارے قائم کیے جائیں گے، ان سے کسی خیر کی توقع رکھنا، یا ان کی ذریعہ معاشرہ میں عدل و اعتدال کے فروغ کی امید رکھنا بالکل عبث ہے۔ ایسے ادارے اور تنظیمیں فساد اور برائی کو زیادہ منظم کر کے معاشرہ کو مزید تباہی کی طرف دھکیل دیتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکی زندگی میں تیرہ برس تک لوگوں کی فکری، علمی اور اخلاقی تربیت فرمائی۔ جب ایمان قبول کرنے والوں کی واضح اکثریت ایمان ویقین اور اخلاق وکردار کے اعتبار سے اس

۱۔ ارشاد العقل السلیم (دار احیاء التراث العربی، بیروت ت ن) ج ا ص ۱۷۲

قدر مضبوط ہوگئی کہ ہر امتحان اور ہر آزمائش کی گھڑی میں انہوں نے ثابت کر دیا کہ نہ تو کوئی حادثہ و آزمائش ان کے ایمان کو متزلزل کرسکتا ہے نہ ہی اخلاق و کردار کے جس بلند مقام کو وہ حاصل کر چکے ہیں اس میں کوئی ضعف اور کمزوری پیدا ہوسکتی ہے، اس لیے کہ امت مسلمہ ہر طرح سے اعتدال کی راہ پر گامزن ہو چکی ہے۔ اس میں وہ توازن اور اعتدال پیدا ہو چکا ہے جو اس دنیا میں منصب خلافت کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے۔ اس پس منظر میں ۲ھ ہجری میں تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا، جو امت مسلمہ کے لیے اس بات کا اعلان تھا کہ دنیا بھر کی امامت و قیادت کی ذمہ داری اب ان کے سپرد کی جارہی ہے۔ اسی موقعہ پر یہ آیت بھی نازل ہوئی:

''وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآئَ عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا'' (البقرہ ۲:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں امتِ وسط (معتدل) بنایا تا کہ تم دنیا بھر کے لوگوں پر (حق کے) گواہ رہو۔

اس آیت مبارکہ میں امت مسلمہ کو امتِ وسَط قرار دیا گیا ہے، وَسَط کو اردو زبان میں توازن اور اعتدال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، یعنی ایسی امت جو اپنے تمام معاملات میں متوازن اور معتدل ہو، اس لیے کہ توازن اور اعتدال کے بغیر نہ تو شہادت حق کا فریضہ انجام دیا جا سکتا ہے، نہ ہی امامت و خلافت کے عظیم منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ امت مسلمہ دنیا بھر کے لوگوں کے سامنے حق کی گواہ ہے اور گواہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ عادل ہو، عدل کی صفت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک صدق اور امانت داری کی صفات نہ پائی جاتی ہوں، گویا عدل کا وجود سچائی اور امانت داری کے بغیر ممکن نہیں، لہذا گواہ کے لیے جو شرائط مقرر ہیں امتِ مسلمہ کے ہر فرد کو ان شرائط پر پورا اترنا لازمی ہے۔ ابوالسعود العمادیؒ نے امتِ وسَط کے تعریف اس طرح کی ہے:

''ای متصفہ بالخصال الحمیدۃ خیارا، عدولا، مزکین باالعلم و العمل'' (۱) ''یعنی ایسی امت جو اخلاق حمیدہ سے متصف ہو، خیر کا پیکر ہو، عدل و انصاف کو پوری طرح قائم کرنے والی ہو اور مکمل طور پر علم و عمل سے آراستہ ہو۔''

اس تعریف میں خصال حمیدہ کی شرط لگا کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ امت وسط کا منصب اس وقت حاصل ہو گا جب مجموعی طور پر افرادِ امت میں فضائل اخلاق اجاگر ہوجائیں۔

''خیارا'' کے لفظ سے قرآن حکیم کی درج ذیل آیات کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے:

''وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ

ہم ذیل میں مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب (مہتمم جامعہ ابوہریرہ خالق آباد (نوشہرہ)، سرپرست ماہنامہ القاسم ومصنف کتب کثیرہ) کا ایک مضمون ''عمار خان ناصر۔کس راستے پر چل نکلے'' ماہنامہ القاسم کے شکریے کے ساتھ دے رہے ہیں۔

عمار خان ناصر صاحب (صاحبزادہ مولانا زاہد الراشدی صاحب و مدیر ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ) جاوید احمد غامدی صاحب کے تلمیذ خاص ہیں۔ہمیں جاوید غامدی صاحب اور ان کے مکتب فکر سے بنیادی اختلاف ہی یہ ہے کہ وہ عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب سے متاثر ومرعوب ہوکر کر رہے ہیں۔ دینی معاملات اور عصری مسائل میں انہوں نے جو مؤقف اختیار کیا ہے، رجم سے لے کر حقوق نسواں بل تک اور قادیانیت سے لے کر توہین رسالت تک، ہر جگہ وہ اسی تجدد اور اعتزال کا مظہر ہے۔ چونکہ بات وہ شائستگی ،متانت اور بظاہر دلیل سے کرتے ہیں اور مغرب نے اپنی سیاسی، حربی، علمی اور تہذیبی برتری سے اور ترغیب وتشویق کے سارے پُرامن ذرائع استعمال کرتے ہوئے اور پاکستانی معاشرے میں اپنی گماشتہ حکومتوں کے قیام سے چونکہ یہاں مغرب زدگی کی عام فضا قائم کر رکھی ہے اس لیے بعض جدید تعلیم یافتہ افراد ان سے متاثر ہو رہے ہیں۔

علاوہ ازیں بعض دانشوروں کا خیال یہ ہے کہ مغرب خصوصاً امریکہ اپنی تہذیبی ونظریاتی بالادستی قائم رکھنے، مسلمانوں کو مغلوب اور زیر دست رکھنے اور مسلم معاشرے سے مسلم سأۃ ثانیہ کے لیے اٹھتی لہروں کو دبانے کے لیے اسلام کے ایک ایسے ماڈل کو، جو اُس کی فکری ضرورتوں اور عملی تقاضوں کے مطابق ہو، مسلم معاشرے میں ابھار رہا ہے اور ہر جگہ وہ ایسے دینی سکالرز کو تلاش کر کے ان کی حوصلہ افزائی اور حمایت کر رہا ہے اور ان سے کام لے رہا ہے جو دین کی تفہیم وتشریح اس کی ضرورتوں کے مطابق کرنے کو تیار ہوں۔ ان کے نزدیک استعمار کی یہ خدمت جس طرح ماضی میں سرسید، قادیانی اور پرویز بجالائے آج کل یہی خدمت پاکستان میں جاوید غامدی صاحب اور ان کے شاگرد بجالا رہے ہیں۔

ہمارے علماء کرام جاوید غامدی صاحب یا ان کے کسی شاگرد کے خلاف قلم اٹھاتے ہوئے اگر اس صورت حال کو بھی سامنے رکھیں تو وہ ان کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے اور اپنے قارئین کو زیادہ مؤثر انداز میں ان کی حقیقت سے آگاہ کر سکیں گے۔ امین

الْمُفْلِحُوْنَ'' (آل عمران ۳:۱۰۴)

''تم میں ایک گروہ ضرور ایسا ہونا چاہیے جو لوگوں میں بھلائی کے کاموں کی دعوت دے، اچھے کاموں کا حکم دے اور برائی کی روک تھام کرے، یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔''

اسی طرح قرآن حکیم کا یہ فرمان:

''كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ'' (آل عمران

(۱۱۰:۳)

''تم بہترین امت ہو، تمہیں دنیا بھر کے لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجا گیا ہے، تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو، منکرات کی روک تھام کرتے ہو اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) تم اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتے ہو''

تیسری شرط امت کا عدول ہونا ہے۔ عدول عربی زبان میں ایسے فرد کو کہا جاتا ہے جس میں صفت عدل خوب راسخ ہو۔ اعتدال اور توازن کا عدل سے بہت گہرا تعلق ہے۔ جو معاشرہ عدل وانصاف کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے وہاں خیر کی قوتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔ عدل فرد اور معاشرہ دونوں میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنے میں مددگار ہوتا ہے، جبکہ ظلم، شر کی قوتوں کو ابھارتا ہے۔ ظلم تلخ ہوتا ہے اور منفی ردعمل پیدا کرتا ہے جو معاشرہ میں قائم توازن کو بگاڑ دیتا ہے۔ ظلم کو ظلم سے نہیں روکا جا سکتا، ظلم کے اثرات کو ختم کرنے کے لیے بھی عدل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

چوتھی شرط مزکین بالعلم والعمل ہے۔ اسلامی معاشرہ کی ابتداء تعلیم وتعلم سے ہوتی ہے۔ انسان کی تعلیم کا آغاز تو تخلیق انسانی کے وقت سے ہی شروع ہو گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ اسلام کو پیدا فرمایا تو انہیں علم سے بھی نوازا۔ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ ۲:۳۱) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی وحی کا آغاز اقرء سے ہوا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں علم کو ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے۔ صحابہ کرام کو پہلی وحی کی پانچ آیات سے حصول علم کی اہمیت کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم وتعلم کا فیصلہ ترجیحی بنیادوں پر طے فرمایا اور ملت کے ہر فرد کے لیے حصول علم کو فرض قرار دیا۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں اصلاح وتطہیر فکر اور اصلاح رویہ کے بارے میں گفتگو کی ہے، فکر اور رویہ کی اصلاح کے ساتھ جب انسان علم کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ علم خود بخود عمل کا قالب اختیار کر لیتا ہے، پھر علم اور عمل میں تضاد باقی نہیں رہتا، اصلاحِ فکر کے نتیجہ میں عقل سلیم پیدا ہوتی ہے جو علم نافع کے حصول پر آمادہ کرتی ہے، اور اصلاحِ رویہ کے نتیجہ میں قلب سلیم پیدا ہوتا ہے، فکر سلیم اور قلب سلیم مل کر ایک ایسے مستحکم معاشرہ کو وجود بخشتے ہیں جس میں ہر خیر، ہر خوبی اور ہر جدید صالح کو قبول کرنے کی بھرپور صلاحیت ہوتی ہے۔ یہی معاشرہ قرآن حکیم کی اصطلاح میں امتِ وَسَط کہلاتا ہے، جو ہر قسم کے غلو اور ہر قسم کی تقصیر سے پاک ہوتا ہے اور اسلام کی یہ تعلیمات معاشرہ کو راہ اعتدال

پر گامزن رکھتی ہیں (جاری ہے)۔

مولانا عبدالقیوم حقانی

غامدی مکتب فکر

عمار خان ناصر۔کس راستے پر چل نکلے؟

قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت اور تحفظِ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سلسلے میں آئینی تحفظات اور قانونی کاوشوں کو ڈائنامیٹ کر دینے کی جدید سائنٹفک مذموم مساعی

عمار خان ناصر اپنے علمی اور قلمی قدوقامت، خاندانی نسبت و شرافت اور ایک مؤقر جریدے کی ادارت کے حوالے سے بظاہر ذمہ دار عالم و فاضل کا عنوان اور علماءِ دیوبند کی نسبت کے حوالے سے ایک جواں سال فکری کاوش کا نام اور پہچان ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کی استقامت سے امت کو استحکام اور پھسلنے سے ایک پوری جماعت کے گمراہ ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

انہی اندیشہ ہائے دور دراز کے پیشِ نظر ماہنامہ القاسم کے ایک بیدار مغز، حساس اور مخلص قاری نے ماہنامہ ''اجتہاد'' (اسلام آباد شمارہ ۵، مئی ۲۰۰۹ء) میں شائع ہونے والے ایک مقالے بعنوان ''نفاذ شریعت، تزکیۂ نفس یا نفاذِ قانون'' کی فوٹو کاپی بھیجی ہے۔ مضمون نگار جناب عمار خان ناصر مدیر ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ ہیں۔

اب کے بار جو مقالہ پڑھا تو رونگٹے کھڑے ہوگئے اور یقین نہیں آرہا ہے کہ کیا واقعتا بھی عمار خان ناصر جیسے ذی علم، ذی استعداد اور صاحب فضل و کمال بھی ایسی بات لکھ سکتے ہیں۔ اگر یہ بات کسی پرویزی، کسی غامدی، کسی قادیانی، کسی بے دین کالم نویس نے لکھی ہوتی تو کبھی کڑھن نہ ہوتی اور نہ اس سلسلہ میں کچھ لکھنے کی ہمت ہوتی کہ برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ میرے خیال میں آں عزیز کی اس نوعیت کی تحریری کاوشوں سے ملحدوں، دہریوں اور نفاذِ اسلام کی جدوجہد کے خلاف کام کرنے والے دین دشمنوں بالخصوص قادیانیوں کی مذموم تحریکات کو تقویت ملتی بلکہ ان کی ترجمانی ہوتی ہے۔ عمار خان ناصر تحریر فرماتے ہیں:

''اگر کسی معاشرے میں کشف و الہام انفرادی دائرے سے اٹھ کر ایک باقاعدہ ادارتی صورت

اختیار کر چکے ہوں، ان کی بنیاد پر شخصیات اور جماعتوں کے عنداللہ مقبول ہونے یا نہ ہونے کے فیصلے کیے جاتے ہوں، لوگوں کی ان کی طرف دعوت جاتی اور ان کے ساتھ وابستہ ہونے والوں کو نجات کی بشارت دی جاتی ہو، القاء والہام کی بنیاد پر مراقبہ وسلوک کے نظام مرتب کیے جاتے بلکہ سیاسی و مذہبی اختلافات میں بھی حق و باطل کی تفریق کرنا ایک عام چلن ہو، جہاں خواب اور بشارات کسی کے مامور من اللہ ہونے کا ایک مستند ذریعہ سمجھے جاتے ہوں، ایسی فضا میں اگر کوئی شخص ''شبانی سے کلیمی دو قدم ہے'' کا نعرۂ مستانہ بلند کردے اور لوگ اس کے فریب میں مبتلا ہوکر اسے ایک ''امتی نبی'' مان لیں تو انہیں کس حد تک اس کا قصور وار ٹھہرایا جا سکتا ہے اور راہ راست پر لانے کی ہمدردانہ کوشش کرنے کے بجائے ان کا معاشرتی مقاطعہ کرنے اور قانونی اقدامات کے ذریعے انہیں مسلمانوں سے بالکل الگ تھلگ کردینے کو کس حد تک اخلاق، حکمت اور دعوتِ دین کے تقاضوں کے مطابق قرار دیا جاسکتا ہے؟ ایک ایسی سوسائٹی جس میں فحاشی اور جنسی بے راہ روی کے محرکات و ترغیبات بکثرت میسر جبکہ مناسب عمر میں آسان شادی کے مواقع معدوم ہوں، جہاں عالمی سرمایہ دارانہ معیشت کے تحت درآنے والے تہذیبی و اخلاقی اثرات اور ایک ناہموار سماجی ڈھانچے سے پیدا ہونے والی ترجیحات بنیادی کردار ادا کرتی ہوں، جہاں پیشہ ورانہ بدکاری معاشرے میں خواتین کی محکومانہ حیثیت اور ان کے ستیصال پر مبنی ایک مضبوط نظام کی پیداوار ہو، اس صورتِ حال میں زنا کی سزا کو محض قانون کی کتاب میں درج کردینے سے معاشرے کی اخلاقی تطہیر و تربیت کے وہ تقاضے کیونکر پورے ہوں گے جو شریعت کا اصل مطلوب ہے اور کیا دین کے تجویز کردہ اخلاقی و سماجی ڈھانچے کے بغیر یہ سزائیں ایک بے جوڑ سی چیز دکھائی نہیں دیں گی؟'' (ماہنامہ اجتہاد، اسلام آباد، ص ۱۶)

پہلے تو یہ بتایا جائے کہ وہ کون سے لوگ ہیں اور کہاں ہیں جنہوں نے کشف و الہام اور القاء کو واقعتاً بھی ایک مرتب نظام کے تحت باقاعدہ ادارتی صورت دے رکھی ہے، اور خواب و بشارت کو کسی کے مامور من اللہ ہونے کے لیے ایک مستند ذریعہ سمجھتے ہیں؟ اور ملک میں غالب اکثریت بھی انہی کی ہے۔

''شبانی سے کلیمی دو قدم ہے'' کے شاعرانہ نعرۂ مستانہ سے متاثر ہوکر ایک شخص ''امتی نبی'' ہونے کا دعویٰ کرے اور لوگ اسے ''امتی نبی'' مان بھی لیں تو نبوت کے دعویدار اور اس کے پیروکار کو قصور وار ٹھہرانا، ان کا معاشرتی مقاطعہ کرنا اور قانونی اقدامات کے ذریعہ انہیں مسلمانوں سے الگ تھلگ گروہ

اور غیر مسلم اقلیت قرار دینا، عمار خان ناصر کے ہاں اخلاق، حکمت اور دعوتِ دین کے تقاضوں کے سراسر خلاف ہے۔

جس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اکابر و مشائخ اور قومی و ملی زعماء کی نفاذ شریعت سے متعلق تمام تر پارلیمانی جدوجہد بھی بے سود اور بے ہدف تھی، شریعت بل کا معرکہ، حدود قصاص کا نفاذ، قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا اور عظیم تحریک ختم نبوت کا برپا کرنا گویا سعی لاحاصل تھا۔ محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوری، قائد ملت مولانا مفتی محمود، شیخ الحدیث مولانا عبدالحق، ضیغم اسلام مولانا غلام غوث ہزاروی، شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر، حضرت خواجہ خان محمد رحمہم اللہ اور دیگر تمام علماء کرام کی تمام تر مساعی گویا بے سود اور بے جوڑ سی چیز کے لیے رائیگاں جدوجہد تھی، العیاذ باللہ۔

افغانستان میں تو طالبان نے تزکیۂ نفس اور لوگوں کی تربیت کا منفرد خصوصی اہتمام کیے بغیر جو اسلام کا مکمل نظام قانون نافذ کر دیا تھا جس نے پندرھویں صدی میں بھی خلاف راشدہ کی یادیں تازہ کر دی تھیں۔ عمار خان ناصر کے ہاں سب کچھ اکارت گیا۔ عمار خان ناصر اپنی یہی بات الفاظ کے ہیر پھیر سے ماہناہ اجتہاد کے صفحہ ۸ پر یوں تحریر فرماتے ہیں:

''اس کے علاوہ عملاً جن قوانین مثلاً قادیانیوں کے خلاف امتناعی قوانین یا توہین رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سزا وغیرہ پر عمل درآمد پر اصرار کیا گیا، ان کے پس منظر میں زیادہ تر عوامی سطح پر پائے جانے والے جذبات کارفرما تھے جبکہ حقیقی معاشرتی اصلاح کا پہلو اُن میں نمایاں نہیں تھا۔ گویا یہ ساری جدوجہد اصلاً چند خطرات اور تحفظات کے تناظر میں تھی اور اس کے محرکات میں اسلام کے ریاستی و معاشرتی کردار کے تحفظ کے مخلصانہ جذبے کے ساتھ ساتھ مذہبی طبقات کی سیاسی اور معاشرتی بقا (Political & Social Survival) سے نفاذِ اسلام کا تصور نہ صرف عوام بلکہ خود مذہبی طبقات میں پروان چڑھا، وہ مثبت معنوں میں ایک پاکیزہ اور خدا کے مقرر کردہ حدود کے پابند معاشرے کا تصور نہیں، بلکہ محض یہ تھا کہ بعض خلافِ اسلام عناصر کے خلاف امتناعی اور تعزیری اقدامات کتاب قانون میں شامل کر لیے جائیں۔'' (ماہنامہ اجتہاد، ص۸)

عمار خان ناصر کا یہ کہنا کہ'' قادیانیوں کے خلاف امتناعی قوانین یا توہینِ رسالت کی سزا۔۔۔ان کے پس منظر میں زیادہ تر عوامی سطح پر پائے جانے والے چند خطرات، تحفظات، جذبات کارفرما تھے۔'' جناب عمار خان ناصر کی گفتگو میں تضاد ہے، معاشرتی بُرائیاں، عریانی، بے حیائی بقول

ان کے بعض صوفیاء کا مذموم کردار، دہشت گردی، قتل و غارت اور بد امنی لاریب معاشرتی بُرائیاں ہیں مگر مضمون نگار نے قادیانیت اور توہین رسالت جیسے عقائد کے مسائل کو بھی ان میں شمار کر دیا ہے جبکہ قادیانیت اور توہین رسالت کا تعلق عقائد سے ہے، معاشرتی بُرائیوں سے اسے کیا واسطہ ہے؟

جناب عمار ناصر! یہ عوامی سطح کے جذبات نہ تھے یہ تو پوری امت کا مسئلہ تھا۔ دین و عقیدہ اور ایمان کا مسئلہ تھا، عوام اور عوامی سطح کے جذبات نہیں ایمانیات اور خواص یعنی علماء، زعماء دین و سیاسی رہنما سب کا یہی ایمان تھا اور سب کے ایمانی جذبات تھے جس نے پارلیمنٹ میں قادیانیوں کو متفقہ طور پر غیر مسلم قرار دیا اور توہین رسالت کی سزا کو قانونی تحفظ دے دیا۔ پھر توہین رسالت کی سزا بھی

ہماری سرگرمیاں

☆ 'مغربی تہذیب کا تنقیدی جائزہ۔اسلامی تناظر میں' کے موضوع پر جناب احمد جاوید صاحب کا دوسرا ماہانہ لیکچر ۹ جون ۲۰۱۱ء بروز جمعرات صفاء انسٹی ٹیوٹ میں ہوا۔

☆ کراچی یونیورسٹی سے جناب خالد جامعی صاحب (ناظم شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ و ایڈیٹر ماہنامہ 'ساحل' 'جریدہ') اور پروفیسر ڈاکٹر عبدالوہاب سوری (شعبۂ فلسفہ) کے ساتھ ایک فکری نشست ۱۱ جون ۲۰۱۱ء بروز ہفتہ 'مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج' کے موضوع پر صفاء انسٹی ٹیوٹ میں ہوئی۔

☆ صفاء انسٹی ٹیوٹ میں قرآنی عربی کلاسوں کا آغاز ۲۷ جون ۲۰۱۱ء سے ہو رہا ہے۔

☆ جناب ناصر مجتبیٰ صاحب ۱۹ جون ۲۰۱۱ء کو اسلام آباد سے صفاء انسٹی ٹیوٹ میں تشریف لائے اور انہوں نے اپنے مجوزہ اسلامی سکول کے بارے میں مشاورت کی۔ جناب پروفیسر ارشد جاوید صاحب ۲۲ جون ۲۰۱۱ء کو ادارے میں تشریف لائے اور اپنے مجوزہ Success School System کے بارے میں مشاورت کی جو کلاس روم میں نفسیاتی تکنیکس پر زور دیتا ہے۔

☆ صفاء انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اسلامی تربیت پر تین روزہ تعلیمی کانفرنس جولائی کے تیسرے ہفتے میں ان شاء اللہ لاہور میں منعقد ہوگی جس میں ملک بھر کے اسلامی سکولوں کو شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے۔

☆ ملی مجلس شرعی کا ایک اجلاس ۱۳ جون ۲۰۱۱ء کو مرکز القادسیہ چوبرجی میں ہوا جس میں سارے مکاتب فکر کے علماء کرام نے شرکت کی۔ مجلس کی ذیلی کمیٹی برائے اتحاد امت کانفرنس کا اجلاس ۲۱ جون کو مولانا مفتی محمد خان قادری صاحب کی جامعہ اسلامیہ لاہور میں ہوا جس میں اتحاد امت

عوامی سطح کے ''چند خطرات، تحفظات'' جذبات نہیں ہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلم اور غیر مسلم سب اس کے قائل ہیں۔ ختم نبوت اور تحفظ ناموسِ رسالت کے قوانین کو آپ جن خطرات اور تحفظات کے پس منظر میں غیر ضروری قرار دے رہے ہیں کیا آپ بتا سکیں گے کہ وہ خطرات اور تحفظات کیا تھے؟ دنیا بھر کے ملکوں کا یہ قانون ہے، اور دنیا بھر میں توہین رسالت کی سزا کا قانون مروج ہے۔ پاکستان میں ۷۳ء کے آئین کی شق نمبر ۱۹ کو پوری قومی اسمبلی نے متفقہ طور پر منظور کیا۔ دیگر ممالک میں بھی یہ قانون موجود ہے۔ مصر، عرب، ترکی، سری لنکا، برما، برطانیہ، امریکہ، ڈنمارک، فرانس، اٹلی، سویڈن، نیپال میں توہین رسالت کی سزا کا قانون نافذ العمل ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ماہنامہ القاسم مئی ۲۰۱۱ء)

خود کو ''امتی نبی'' کہلوانے والے غلام احمد قادیانی اور ان کے متبعین کی تکفیر، اور اسے مسلمانوں سے الگ گروہ قرار دیے جانے کی آئینی جدوجہد کے پس منظر میں تحریک ختم نبوت کے تاریخ ساز کردار کو بے وزن اور بے معنی قرار دیے جانے کی مذموم حرکات، الفاظ کی بازی گری کا مذموم کھیل، نظری مباحث، ادب و تحقیق اور تجزیہ و تبصرہ کے ذوق کی تکمیل میں ناموس رسالت کی توہین اور شرعی قوانین سے استہزاء اور مذاق ایک بدترین اور مذموم کھیل ہے۔ یہ بات بہرحال میری سمجھ میں آنے کی نہیں کہ یہ کھیل دانستہ کھیلا جارہا ہو اور اگر ایسی نازیبا فکری اور قلمی حرکتیں نادانستہ بھی سرزد ہورہی ہوں تب بھی میں یہی عرض کروں گا کہ:

یہ کھیل کہاں سے کھیلا جارہا ہے؟ کون کھیل رہا ہے؟ کس سے اور کن سے کھیلا جارہا ہے؟ کس نسبت کو استعمال کیا جارہا ہے؟ اور اس کی زد کہاں پڑتی ہے؟ کس کی بے وقعتی ہے؟ کن مسائل، احکام اور نظام کو اٹھا کر باہر پھینکنے کا اشارہ دیا جارہا ہے، کس کی روح کو بے چین کیا جارہا ہے؟ کہیں گنبد خضریٰ کے مکین کی روح کو تو بے قرار نہیں کیا جارہا؟

آزادیٔ تقریر و تحریر اور نظری مباحث چھیڑنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں قرار دیا جاسکتا کہ جب کوئی من چلا چاہے توہینِ رسالت کے قانون سے کھیلنے لگے، قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے والی آئینی جدوجہد اور شرعی احکام کے قانونی تحفظ کو بے جوڑ اور غیر مؤثر قرار دینے کی مذموم مساعی میں لگ جائے۔ حدود قصاص اور اسلامی سزاؤں کے قانونی تحفظ کی بے وقعتی کرے، علماء و اکابر کی عظیم الشان قربانیوں اور متحدہ تاریخی کاوشوں کو قلمی یلغار کے ذریعہ بلڈوز اور ڈائنامیٹ کرنے کی

جسارت کرے اور نفاذِ قانون سے پہلے تزکیۂ نفس کی فکری ونظری بحث چھیڑ کر اکابر کی قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے، تحفظ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے قانونی تحفظات حاصل کرنے اور شرعی احکام کے نفاذ کے لیے آئینی جدوجہد کی تمام تر پارلیمانی/ آئینی اور قانونی مساعی کو بے سود قرار دے، جس کو عمار خان ناصر مذہبی طبقات کی سیاسی اور معاشرتی بقاء (Political & Social Survival) کی کارفرمائی اور اسے محدود اور ایک رُخے اندازِ فکر (Approach) کا نام دے رہے ہیں۔ امت اسے عین ایمان، عین دین اور پوری امت کا متفقہ مسئلہ قرار دیتی ہے۔

عمار خان ناصر! نفاذِ شریعت کے لیے نظام شریعت کو آئینی اور قانونی تحفظ دے کر افغانستان کے طالبان کی طرح مخلص اور مومن قیادت کو اقتدار سونپنا ہوگا۔ جہادی کردار کے ذریعہ منافق قیادت کا قلع قمع کرنا ہوگا اور پندرہویں صدی میں بھی عدیم الوسائل طالبان کی طرح یورپی عالمی برادری کی شدید مزاحمت و مقابلہ کے باوجود اسلامی نظریۂ حیات اور نظام امن و عدل کو نافذ کر کے اس گئے گزرے دور میں بھی نظامِ خلافت راشدہ کی جھلکیاں دکھانا ہوں گی۔

تزکیۂ نفس احمد جاوید

فکر آخرت (۲)

س: آخرت پر پورے یقین کے باوجود موت کا خوف ایک حقیقت ہے اس کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟

ج: دین دار آدمی میں موت کا خوف دراصل جوابدہی کا خوف ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس ملک القہار کے آگے جواب دہی کا تصور اچھے اچھوں کا دل دہلانے کے لئے کافی ہے۔ اس میں کوئی ہرج نہیں بلکہ اس میں دینداری کی وہ قوت ہے جو زندگی کو اللہ کی مرضی کے مطابق گزارنے کا داعیہ پیدا کرتی ہے۔ احکام الٰہیہ کی اطاعت کا بڑا سبب ظاہر ہے، کہ موت کا خوف ہے نہ کہ موت کی رغبت یعنی بندگی کا جوہر دنیاوی زندگی میں مرنے اور مرنے کے بعد حساب کتاب کے ڈر کی بنیاد پر ظاہر ہوتا ہے اور تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس معنی میں موت کا خوف ایک روحانی قوت ہے جس کی بناء زندگی یا دنیا سے محبت پر نہیں بلکہ اللہ کی پکڑ کے اندیشے پر ہے۔

البتہ کسی دین دار آدمی میں اس کے ساتھ ساتھ موت کا نفسیاتی اور طبعی خوف بھی پایا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگ بیماری کی تکلیف سے ڈرتے ہیں، سکرات کی اذیت سے خوفزدہ ہوتے ہیں، قبر میں دبائے جانے کے تصور سے انہیں وحشت ہوتی ہے یا اپنے عزیزوں دوستوں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ جانے کا قلق ان کے اندر موت کو ایک خوفناک یا غیر مرغوب چیز بنا دیتا ہے۔ ان تمام باتوں میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ اول تو یہ اختیاری نہیں اور دوسرے ان کی وجہ سے اس آدمی کی زندگی کے طور طریق پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ دل کی کمزوری، طبیعت کی حد سے بڑھی ہوئی نرمی، مزاج کی نزاکت اور اعصابی کمزوری سے اس طرح کی حالت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ یہ حالت جب تک شرعی اور اخلاقی ضرر تک نہیں پہنچاتی دینی اعتبار سے مذموم نہیں ہے۔

س: موت سے وحشت اگر فطری و طبعی ہے تو پھر دینی اعتبار سے خرابی کیوں ہے؟

ج: موت سے وحشت ایک غیر اختیاری احساس کے طور پر جب تک وہ نتائج نہیں پیدا کرتی جو عقیدے اور عمل صالح کے منافی ہوں، شریعت اس پر کوئی حکم نہیں لگاتی لیکن اگر یہ وحشت اپنی طبعی حد سے تجاوز کر کے کسی محکم خیال یا ذہنیت اور کسی مسلسل عمل یا طرز زندگی میں ڈھل جائے تو شریعت کا حکم جاری ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی طبعاً ڈرپوک ہے تو وہ از روئے شریعت گناہگار نہیں ہے لیکن اس کی یہ حالت اگر جہاد سے رکاوٹ بن جائے یا حق بات کہنے سے روک دے یا کسی بھی زبردست کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کر دے تو اس صورت میں اس شخص کو دینی اعتبار سے ناقص، کمزور بلکہ بے دین تک کہا جا سکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ طبعی داعیات ایک سطح تک کوئی اخلاقی معنی نہیں رکھتے۔ ان کی قانونی حیثیت وہی ہے جو مثلاً اوہام اور وساوس کی ہے۔ ہاں! جب یہ داعیات شعور اور ارادے میں اپنی قبولیت پیدا کر کے باقاعدہ ایک فکری اور عملی رویے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو پھر انہیں شرعی معیارات پر دیکھا جاتا ہے اور ان کے صحیح و غلط کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ دین کو موت سے ایسی وحشت ہی ناپسند ہے جو دینی فکر، دینی طبیعت اور دینی عمل کے بنیادی سانچے پر اثر انداز ہوتی ہو۔ اس طرح کی وحشت اپنے سبب میں بھی محض طبعی نہیں ہوتی بلکہ دنیا کی محبت اور عارضی زندگی کی کشش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کم از کم ہر آدمی اس بات کو بآسانی پہچان سکتا ہے کہ اس کے

اندر پائی جانے والی موت سے وحشت کا سبب کیا ہے۔ اگر سبب یہ دوسرا ہے تو پھر طبیعت وغیرہ کا عذر جھوٹا اور نا قابل قبول ہے۔

س: دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگوں کو موت سے وحشت نہیں بلکہ اس کی طرف شدید رغبت ہوتی ہے۔ آپ ان لوگوں کا تجزیہ کس طرح کریں گے؟

ج: وحشت کی طرح رغبت کی بھی دو بنیادیں ہیں۔ دینی اور نفسیاتی۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ ایک عارضہ ہے جو ناکامی، بے اطمینانی اور ڈیپریشن وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے۔ البتہ دینی نقطۂ نظر سے موت کی طرف رغبت، بعض شرائط کے ساتھ، شخصیت کے ایک مثبت پہلو پر دلالت کرتی ہے۔ وہ مثبت پہلو اللہ کی محبت اور حصول جنت کی قوی امید ہے۔ بعض لوگوں کی دینی شخصیت اتنی مکمل اور حقیقی ہوتی ہے کہ اللہ سے ملاقات کا تصور ان کے لئے ہر چیز سے بڑھ کر محبوب اور مرغوب ہوجاتا ہے۔ شخصیت کا یہ رنگ دین کو مطلوب ہے لیکن بعض قیود کے ساتھ۔

س: وہ شرائط اور قیود کیا ہیں؟

ج: بہت سی ہیں، مثال کے طور پر:

۱۔ اللہ کی ہیبت اور خوف اس محبت سے خارج نہ ہو۔

۲۔ بندگی عمل کا بھی نام ہے اس لئے عملی پہلو کمزور نہیں ہونا چاہیے۔

۳۔ اللہ کی معبودیت کا رنگ انسانی محبوبیت سے بالکل پاک ہونا چاہیے۔ غلبۂ عشق عموماً اصلاح نفس کی فکر سے بے گانہ کر دیتا ہے۔ یہ بیگانگی نہیں ہونی چاہیے اور اپنی اصلاح کے لئے جو مجاہدہ، جیسی فکر اور جتنی شکستگی درکار ہے وہ اوروں کے مقابلے میں زیادہ پختگی اور کمال کے ساتھ موجود ہونی چاہیے۔ عاشقانہ بے تکلفی اللہ کی جناب میں گستاخی ہے۔ یہ نہیں ہونی چاہیے۔

۴۔ اللہ محض جمال نہیں ہے صاحب قہر و جلال بھی ہے۔ یہ تصور بھی پورے تیقن اور شدت کے ساتھ موجود ہونا چاہیے۔

۵۔ اتباع سنت کے معروف اور عمومی مفہوم سے منفرد اور متجاوز نہیں ہونا چاہیے۔

۶۔ احوال، تصورات اور اعمال صحابہ کے نمونے پر ہونے چاہئیں۔

مختصر یہ کہ اللہ سے ملاقات کا شوق اس کے وصل وغیرہ کی خواہش کا نام نہیں ہے یہ تو ایک عاجز اور مخلص بندے کی سب سے گہری تمنا ہے جو وہ خوف و رجاء کے مثالی توازن کے ساتھ اپنے اندر ہمیشہ موجود رکھتا ہے۔

احساس ذمہ داری

س: احساس ذمہ داری سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج: عمل کا نتیجہ یقینی ہوتو آدمی اس عمل کو جس انداز سے سرانجام دیتا ہے اس انداز کو احساس ذمہ داری کہتے ہیں یعنی مومن کے لئے یہ دنیا دارالعمل ہے، زندگی پوری کی پوری ایک سلسلۂ اعمال ہے جس کے نتائج آخرت میں نکلیں گے، یہ یقین دنیاوی زندگی میں جس چیز کو ہمیشہ زندہ رکھتا ہے وہ ہے احساس ذمہ داری۔ بندہ دنیا میں رہتے ہوئے اللہ سے تعلق میں مطلوب بہت سے احساسات کو وقتاً فوقتاً معطل رکھ سکتا ہے لیکن اپنی ذمہ داری کے احساس کو زندگی کے کسی مرحلے پر بھی فراموش نہیں کرسکتا۔ دنیاوی زندگی کا سب سے بڑا تقاضا اور اس زندگی میں آخرت کو ماننے کا سب سے بڑا داخلی ثبوت یہی احساس ذمہ داری ہے۔ بندگی کی پوری عمارت دنیا میں اسی بنیاد پر قائم ہے۔

س: کیا احساس ذمہ داری کا تعلق صرف عمل سے ہے؟

ج: جی نہیں! اس کا تعلق دین کے تمام تقاضوں کی تکمیل سے ہے خواہ وہ عقیدے کی صورت میں ہو یا عمل کی، اخلاق کی صورت میں ہو یا خیالات کی۔ دینی ذمے دارے رکھنے والا ایک سنجیدہ شخص اس فکر سے کبھی آزاد نہیں ہوسکتا کہ اس کی بندگی کا ہر پہلو مطابق دین، صحیح اور مکمل ہونا چاہیے۔ ہمارے اندر اصلاح اور ترقی کا ہر عمل اسی کی مسلسل فکر سے پیدا ہوتا ہے۔

س: احساس ذمہ داری کے مظاہر کیا ہیں؟

ج: تعمیل احکام، اپنی دینی اصلاح کی مکمل کوشش اور اتباع سنت۔

س: اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟

ج: احساس ذمہ داری کی پیدائش کے دو اسباب فطری ہیں: سزا کا خوف اور حمیت۔ خوفِ سزا کا

محرک ہونا واضح ہے لہٰذا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ حمیت کے معاملے کو تھوڑا سا سمجھ لینا چاہیے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا مکمل طور پر ایک اختیاری چیز ہے۔ ہم مسلمان ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اپنے اختیار کے ساتھ مسلمان ہیں مجبوراً نہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں ہم نے اپنے لئے اسلام کو پسند کر کے اللہ سے مسلمان بننے اور رہنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس وعدے کو توڑنا طبعاً خلاف حمیت ہے اسی لئے احساس ذمہ داری تسلسل کے ساتھ اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتا جب تک اس کے پیچھے جذبۂ حمیت کام نہ کر رہا ہے۔

س: کیا احساس ذمہ داری کی یہی دو بنیادیں ہیں؟

ج: جی نہیں! ہم نے یہ دو ایسے اسباب بیان کئے تھے جو تمام انسانوں میں مشترک اور فطری ہیں۔

اسلامی سکولز توجہ فرمائیں

ملک بھر میں جو سکول اسلامی نقطہ نظر سے کام کر رہے ہیں ان کے ذمہ داران کو ملاقات، باہمی مشاورت اور اسلامی تعلیم و تربیت سے متعلقہ مسائل پر غور و فکر کا موقع مہیا کرنے کے لیے تحریک اصلاح تعلیم (ٹرسٹ) کا ادارہ صفاء انسٹی ٹیوٹ ایک تین روزہ قومی تعلیمی کانفرنس جولائی کے تیسرے ہفتے میں لاہور میں منعقد کر رہی ہے۔

جن سکولوں کے پرنسپل صاحبان اس کانفرنس میں شریک ہونا چاہتے ہوں وہ تفصیلات کے لیے رجوع فرمائیں۔

تین روزہ قومی تعلیمی کانفرنس

موضوع: اسلامی تعلیم و تربیت ــــ مسائل، امکانات اور چیلنجز

صفاء انسٹی ٹیوٹ

A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور

فون 042-36149359،0300-435 4673،0300-460 9522

ویب: www.safa.edu.pk ای میل: ermpak@hotmail.com

اس درجے کی اور بھی کچھ چیزیں ہیں جنہیں بیان ہونا چاہیے لیکن اس سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ کوئی ذمے داری لے کر اس کو نبھانے کا مستقل احساس اور خیال اپنی بناوٹ میں نفسیاتی بھی ہے اور طبعی بھی۔ اخلاقی بھی ہے اور دینی و روحانی بھی۔ جب ہم کسی چیز کو فطری کہتے ہیں تو اس کا پہلا اور ابتدائی مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز ایک نفسیاتی اور طبعی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ عام بات ہے۔ دوسرے درجے میں فطری کا لفظ ایک خصوصیت اختیار کرتا ہے یہاں اس کے اندر اخلاق کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں یعنی جس آدمی میں اخلاقی شعور اور حِس ہو گی اس کے لئے یہ چیز فطری ہے۔ تیسرے درجے میں فطری کا مطلب روحانی یا دینی ہے۔ یہاں یہ اپنی حیثیت کو بالکل خاص کر لیتا ہے اور صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے جن کے اندر روحانی احساس اور دینی شعور و جذبہ بنیادی قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھیں کہ یہاں فطری کا تعین شخصیت کے اعتبار سے ہو گا۔ شخصیت میں ایک عموم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک سطح پر ہر انسان شخصیت کا حامل ہے وہ سطح نفسیات اور طبیعت کی ہے۔ دوسری سطح پر انسانوں کی اکثریت ایک شخصیت کی مالک ہے۔ یہ اخلاقی شخصیت ہے۔ اور اپنے انتہائی درجے میں اخلاقی شخصیت رکھنے والوں کی اکثریت ایک خاص شخصیت رکھتی ہے۔ اسے ہم نے روحانی یا دینی کا نام دیا ہے۔

جب کوئی ایسا وصف مطلوب ہو جو شخصیت کی تمام سطحوں کے لئے ضروری ہو تو اس کی پیدائش کے اسباب تمام درجات شخصیت کی مناسبت سے تلاش کرنے چاہئیں۔ اس میں قابل عمل اصول یہ ہے کہ اس کی پیدائش کا عمل شخصیت کے عام درجے سے شروع ہو اور پھر خاص سے خاص الخاص حصے تک پھیل جائے۔ اس اصول کے پیش نظر ہم نے شخصیت کے عمومی حصے میں احساس ذمہ داری کی دو بنیادیں یا دو اسباب و محرکات عرض کئے تھے۔ اس سے اوپر اٹھ کر یعنی اخلاقی شخصیت کی سطح پر ظاہر ہے کہ اسباب و محرکات بدل جائیں گے۔ یہاں سزا کا خوف برقرار رہے گا بلکہ یہ خوف آخر تک برقرار رہے گا لیکن اس کی معنویت بدل جائے گی۔ اس سطح کا اصل محرک تصور خیر ہے۔ اخلاقی شخصیت رکھنے والا بندہ خیر اساس ہوتا ہے۔ اس کے تمام فیصلے، اعمال اور تصورات خیر ہی کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کی طلب خیر کو بڑھا دیا جائے تو اس کے اندر خیر کے ساتھ وابستگی کے تمام

تقاضے پورے کرنے کی وہ قوت اور استعداد پیدا ہو جاتی ہے جسے احساس ذمہ داری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا اب تیسرا سبب یا محرک ہوا طلب خیر کا داعیہ۔

دینی شخصیت کے لئے اس احساس کی پیدائش، ترقی اور تکمیل کے سب سے بڑے اسباب و محرکات خشیت و محبت ہیں یعنی اللہ کا خوف اور اللہ کی محبت۔ ان دونوں کے ملنے سے وہ کمال و فا داری ہاتھ آتا ہے جو اصل بندگی ہے اور دین کے تمام مطالبات کی روح ہے۔ یہ نہ ہو تو نہ ایمان کوئی چیز ہے اور نہ اخلاق و اطاعت۔ گویا دین ہی بے معنی ہے اگر دین کو ماننے والا ہر حال میں اپنے معبود کا وفادار نہیں۔ اس انتہائی بنیادی ضرورت کی تکمیل کا انحصار اسی احساس ذمہ داری پر ہے لہٰذا اسے محض نفسیاتی یا اخلاقی معنی میں نہیں لینا چاہیئے بلکہ اس کو بندگی کی شرط لازم اور دین سے وابستگی کی سب سے بڑی صورتوں میں سے ایک سمجھنا چاہئے اور اس میں کمی کے ازالے کی کوشش اس کی یہ اہمیت ملحوظ رکھ کر کرنی چاہئے۔

مختصر یہ کہ دین ایک عملی شخصیت کا مطالبہ کرتا ہے جس کے بغیر آدمی کا یہ دعویٰ نا قابل قبول ہے کہ وہ دین کے ساتھ سچی نسبت رکھتا ہے۔ اس شخصیت کا جوہر احساس ذمہ داری ہے جو اس کی نیت کو خالص اور عمل کو صحیح اور مستقیم رکھتا ہے۔ یہی دین کی مطلوبہ عملی شخصیت ہے کہ بندہ نیت میں خالص اور عمل میں صحیح و مستقیم ہو۔

کس قیامت کے یہ نامے

☆ جناب ایڈیٹر صاحب! آپ عجیب سادہ لوح آدمی ہیں کہ مختلف دینی مکاتب فکر کے درمیان اتحاد پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ارے صاحب! یہ مکاتب فکر نہیں، یہ فرقے ہیں فرقے اور فرقے بنانا حکم قرآنی کی صریح خلاف ورزی ہے۔ یہ شرک اور حرام ہے۔ آپ کس خوش فہمی میں مبتلا ہیں اور کس کار بے خیر میں لگے ہوئے ہیں۔

آفتاب عروج، چنیوٹ

☆ محترم ایڈیٹر صاحب! ما شاء اللہ آپ نے اپنے رسالے کی پیشانی پر قرآنی آیت لکھ کر اس کا مقصد اصلاح قرار دیا ہے ــــ تعلیم کی اصلاح، میڈیا کی اصلاح، فرد کی اصلاح، معاشرے کی

اصلاح۔۔۔ اور آپ کو اتنا نہیں معلوم کہ فرد اور معاشرے کی اصلاح کا سب سے بڑا ذریعہ جہاد ہے لیکن آپ کو اس موضوع پر کبھی ایک حرف لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت دے۔

خادم المجاہدین، پشاور

☆ آپ کی ڈبل پی ایچ ڈی سے توقع تھی کہ آپ کا پرچہ علمی اور تحقیقی ہوگا لیکن البرہان دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے۔ نہ حوالے، نہ مراجع، نہ فہرست کتابیات، نہ ٹھوس علمی مضامین۔ اخباری قسم کے مضامین ہوتے ہیں اور وہ بھی زیادہ تر مدیر صاحب کے اپنے۔ کیا اس ملک میں اہل علم وتحقیق کا کال پڑ گیا ہے یا کوئی آپ کو گھاس نہیں ڈالتا؟

۔۔۔۔ جامعہ پنجاب

☆ آپ کے البرہان کا جو شمارہ بھی دیکھو مغربی تہذیب کے خلاف ایک دو مضمون ضرور ہوتے ہیں۔ کیا مغربی تہذیب میں کوئی خوبی آپ کو نظر نہیں آتی؟ کیا یہ کفر ہے؟ یہ ہوتا ہے فکر کا یک رُخا پن جبکہ حقیقی سکالر ہمیشہ غیر جانبدار اور معروضیت کے علمبردار ہوتے ہیں نہ کہ ہمیشہ کسی ایک نظریے کو رگیدنے والے۔

شمس الحق، راولپنڈی

تالیفات ڈاکٹر محمد امین

تعلیم وتربیت

		صفحات	قیمت
۱۔	ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل۔ چند نظریاتی مباحث (دوسرا ایڈیشن)	۵۴۰	۲۵۰ روپے
	اسلامی تناظر میں تعلیمی نظام کی تشکیل نو۔ ماڈل اسلامی سکول، یونیورسٹی اور نظام تعلیم کا عملی خاکہ ثنویت کے خاتمے کا طریق کار، نفاذ اسلام اور مسلم نشأۃ ثانیہ میں تعلیم کا کردار، وغیرہ		
۲۔	ہمارا دینی نظام تعلیم ☆	۳۱۴	۳۵۰
	دینی تعلیم کے چار وفاقوں کے ذمہ دار علماء سے طویل مشاورت اور مباحثے کے نتیجے میں دینی مدارس کے لیے اصلاحی تجاویز اور متبادل نصاب		

۳۔ **تعلیمی ادارے اور کردار سازی** اس سوال کا جواب کہ جدید تعلیمی اداروں میں اسلامی نقطہ نظر سے بچے کی تربیت اور کردار سازی کیسے کی جاسکتی ہے؟	۱۵۳	۸۰
۴۔ **جدید اسلامی نصاب تعلیم** ☆ پہلی سے بارھویں جماعت تک، سارے مضامین کے لیے، دینی اور عصری علوم کے امتزاج پر مبنی	۲۳۱	۲۶۰
۵۔ **پاکستان میں تعلیم کی اسلامائزیشن** ☆	۴۲	۴۷
۶۔ **مطالعۂ قرآن وحدیث** (برائے جماعت اوّل تا پنجم) ہر جماعت کے لیے الگ۔ مروجہ دینیات سے الگ اور زائد مطالعہ کے لیے	۲۴۰	۱۹۰
۷۔ **بروشرز**		
۱۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام	۱۲	
۲۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟	۱۶	
۳۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات	۱۲	۵۰
۴۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام	۱۲	
۵۔ والدین کے نام ایک اہم پیغام	زیر طبع	
۶۔ نوجوانوں کے نام ایک اہم پیغام	زیر طبع	

تربیت وتزکیہ

۱۔ **اسلام اور تزکیۂ نفس۔ مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ** تعمیر سیرت کا اسلامی منہج قرآن وسنت کی روشنی میں۔ مسلم ادارے اور تجربات۔ مغربی فکر وعمل سے ان کا موازنہ۔ ایک علمی، فکری اور تحقیقی تجزیہ	۹۰۴	۶۰۰
۲۔ **ترکِ رذائل** بُرے اخلاق، ان کے اسباب، نقصانات اور ان سے بچنے کے عملی طریقے	۲۹۲	۱۹۰
۳۔ **حقیقتِ تزکیۂ نفس** (سوالاً جواباً) ☆ مختصر، سادہ، عام فہم اور غیر اختلافی انداز میں اہم مسئلے کی وضاحت	۵۵	۵۲
۴۔ **حقیقتِ تصوف**	۸	۵

قرآن وسنت

۱۔ **سورہ یٰسین** زیرطبع

دورنگوں میں، بیک وقت تین تراجم (لفظی، بامحاورہ اور تفسیری)

مع قرآنی عربی الفاظ کے اردو استعمالات کی نشاندہی کے

۲۔ **Riyadh-us-Saliheen (2 Vols)** ۱۴۵۴

۱,۰۰۰

حدیث اور تزکیۂ نفس کی معروف کتاب ریاض الصالحین

اور اس کے حواشی کا انگریزی ترجمہ

۳۔ **Noble Quran, Part 1** ☆ ۷۰ ۶۰

قرآن حکیم کے پہلے پارے کا انگریزی میں لفظی ولغوی ترجمہ

۴۔ **Noble Quran, Part 2-9** ☆ ۸۳۸ ۹۳۸

پارہ ۲ تا ۹ کا انگریزی میں لفظی ولغوی ترجمہ

فقہ وقانون

۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون ☆ ۲۷۳ ۳۰۰

۲۔ **Islamization of Laws in Pakistan** ۲۵۸ ۲۰۰

پاکستان میں مروجہ قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کی

جدوجہد کا علمی تجزیہ، ضیاء الحق دور کا خصوصی مطالعہ

۳۔ **السلطة التشريعية۔ دراسة مقارنة (عربی)** ☆ ۱۶۹ ۱۹۵

اسلام میں اجتہاد اور مغرب میں قانون سازی کے عمل کا تقابلی مطالعہ

مسلم امہ

۱۔ **مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل** ۴۰۷ ۲۵۰

اس اہم سوال کا جواب کہ مسلمان کس طرح زوال کے موجودہ گرداب سے نکل سکتے ہیں

اور کس طرح دوبارہ غلبہ وعروج سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ مکمل لائحہ عمل

۲۔ **اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش۔ ایک تجزیہ، ایک مطالعہ** (دوسرا ایڈیشن) زیرطبع

۳۔ **جہاد اور دہشت گردی۔ عصری تطبیقات** ۱۳۰ ۱۰۰

۴۔ **مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ** ۱۲ ۸

سیاسیاتِ اسلام

۱۔ **اسلام اور پاکستان** ☆ ۱۲۷ ۱۵۵

پاکستان میں نفاذ اسلام کا صحیح طریق کار
۲۔ اسلامی انقلاب۔مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی ☆ ۱۳۳ ۱۴۰
۳۔ سیاسی جماعتوں کی شرعی حیثیت ☆ ۴۵ ۵۰
۴۔ اسلام اور جدید سیاسی مسائل زیر طبع

اسلام (متفرق)

۱۔ رزم حق و باطل ☆
ان مسلم داعیوں اور حریت پسندوں کا تذکرہ
جنہیں کج فہم مسلم حکمرانوں سے کشمکش کرنا پڑی ۱۱۸ ۱۳۰
۲۔ مقالاتِ امین (دو جلدیں) ☆ ۱۲۵۸
۱۳۵۰
ان مضامین و مقالات کا مجموعہ جو مختلف اوقات میں جرائد و اخبارات میں چھپتے رہے
۳۔ عصر حاضر میں تعبیر دین زیر طبع
۴۔ ایک نئی دینی تحریک کی ضرورت زیر طبع

☆ فوٹو کاپی مہیا کی جاسکتی ہے۔

۔ خرید کتب کے لیے تحریک اصلاح تعلیم کے دفتر سے رابطہ کیجیے، فون نمبر 0300-4609522

۔ مندرجہ بالا قیمتوں میں ڈسکاؤنٹ شامل ہے ڈاک خرچ شامل نہیں جو موجودہ قیمت کا ۱۵% ہوگا۔

طریق ادائی: منی آرڈر یا پے آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ، 71-A فیصل ٹاؤن، لاہور۔